محرابِ غزل

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

With best Compliments.
Mr. Pervez
A. [illegible]
President:
Reception Committee
19. 12. 56.

محرابِ غزل

محرابِ غزل

روشؔ صدیقی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

قیمت تین روپے

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی

شاخ دہلی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اُردو بازار۔ دہلی ۶

شاخ بمبئی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

طبع اوّل اگست ۱۹۵۶ء ۱۰۰۰

یونین پرنٹنگ پریس۔ دہلی

محرابِ غزل

(میں)

ہمہ تن گوش ہے وہ شاہدِ زیبائے غزل
ہے سکوتِ ازلی، حسنِ تقاضائے غزل
نالۂ نیم شبی، شمعِ گزر گاہِ حبیب
دیدۂ اشک فشاں منزلِ سلمائے غزل
چشمِ ساقی کا عطیہ ہے یہ سرمستیٔ شوق
چشمِ ساقی سے عبارت ہے یہ مینائے غزل
تجھ سے کہتا ہوں، یہ اے خلوتیٔ حسنِ خیال
ہے ترے خواب کی تعبیر زلیخائے غزل
سینکڑوں نجد ہیں بیتاب قدمبوسی کو
کس کی جانب ہے رواں، محملِ لیلائے غزل

لالہ و گل مہ و انجم کے جہاں سے آگے
دور پہونچی ہیں نگاہیں یہ تقاضائے غزل
ہے ہر اک لمحہ، فزوں وقت کی رفتار کے ساتھ
کہیں محدود نہیں، نشۂ صہبائے غزل
زندگی جملۂ آفاق میں جاگ اٹھتی ہے
دلِ خاموش کو ہوتا ہے جو القائے غزل

مہ و پرویں نے سرِ راہ بچھائی آنکھیں
نظر آیا جو کوئی بادیہ پیمائے غزل
گریۂ عشق کی عظمت کو سمجھتے ہیں نجوم
اپنی پلکوں سے جو چنتے ہیں گہرہائے غزل
چاک ہو سینۂ کونین تو کھل جائے یہ راز
زندگی درد ہے اور درد سراپائے غزل
لمحہ، لمحہ، ہے ازل اور ابد سے ہمدوش
کس نے دیکھا ہے ابھی جلوۂ فردائے غزل
ہیں ہم آہنگ یہاں، رنگِ الم، رنگِ نشاط
کہ یہ ہر رنگ ہے انساں سخن آرائے غزل
ذہنِ گیتی پہ کشادہ ہیں ہزاروں راہیں
ہے یہ سب سلسلۂ نقشِ کفِ پائے غزل

ہر تخیل کے لیئے لاکھ ہیں اندازِ بیاں
لاکھ پردوں سے عیاں حسنِ دلآرائے غزل
دیکھتا کون، رخِ شاہدِ معنیٰ کی بہار
گر یہ پیراہنِ خوش زیب نہ پہنائے غزل
حسنِ اندازِ تکلم کے ہزاروں اسلوب
سخن آموز جہاں ہیں یہ تقاضائے غزل

ہوش رہتا کسے اس دور میں حق گوئی کا،
اگر افسانۂ منصور نہ دہرائے غزل
خوب و ناخوب کی تنقید کا یارا تھا کسے
گر صفِ ژرف نگاہاں میں نہ در آئے غزل
لب کُشا کیا کوئی ہوتا، اگر اُس محفل میں
ترجمانِ دلِ خاموش نہ بن جائے غزل
ٹوک سکتا تھا یہاں کون ستم گاروں کو
نہ اگر قالبِ شمشیر میں ڈھل جائے غزل
آتشِ وعظ و خطابت کا بھرم کیا کھلتا
تختۂ دار سے گر پھول نہ برسائے غزل
دیدنی ہے یہ گدازِ غمِ پنہاں کا جلال
شاخِ گل بن گئی شمشیر، بہ ایمائے غزل

ہستیٔ و مرگ کے فرسودہ مسائل ، توبہ
کب سلجھتے تھے اگر ان کو نہ سلجھائے غزل
یہ فسونِ ازلی ، فلسفۂ غیب و شہود
حرفِ اوّل ہے سرِ مکتبِ انشائے غزل
دلِ انساں کا ہر اک رازِ عیاں ہے جس سے
وہ صحیفہ ہے رخِ شاہدِ زیبائے غزل

حُسنِ معصوم کو خود سے بھی گریزاں پا کر
اک زرا چھیڑ دیا میں نے یہ ایمائے غزل
خوب ہے شیوۂ تمکیں ، مگر اے شاہدِ ناز
کہیں خود بڑھ کے ، قدمبوس نہ ہو جائے غزل
اب کسے یاد ہے رسم و رہِ تقدیمِ نیاز
ہوش میں کون ہے اے انجمن آرائے غزل
نکہتِ زلفِ پریشاں کا سہارا لے کر
نہ کہیں دوشِ تغافل پہ بکھر جائے غزل
خلد گُم گشتہ ، زمیں پر اُتر آئے نہ کہیں
لبِ لعلیں کی فضاؤں کو نہ چھو جائے غزل

اے ستارو! مری محفل میں یہ کون آتا ہے
بچھ گئے فرش قدم بن کے گہرہائے غزل
خلد ہی خلد، زمیں بوس ہیں تا حدِّ نظر
مسندِ رہ گزرِ دوست ہیں گلہائے غزل
پیشِ محبوب کچھ اس طرح غزل خواں تھا روش
ہے لبِ زہرہ و ناہید پہ بھی ہائے غزل

الف

ترا غم ، راز میرا ، خاموشی میری ، سخن میرا
یہی ہے رُوح میری ، حُسن میرا ، پیرہن میرا

مرا مسکن ، مری منزل ، نہ دنیا ہے نہ عقبیٰ ہے
ترے دل کے کسی گوشے میں تھا شاید وطن میرا

حرم والوں نے سمجھا زندگی بھر اجنبی مجھ کو
صنم خانے میں اب تک منتظر ہے برہمن میرا

وہ اعجازِ تکلّم کیا بیاں ہو ، ہم نشیں ، لیکن
سکوتِ بزم کی تصویر ہے حُسنِ سخن میرا

مرا ذوقِ سفر ہے بے نیازِ جادہ و منزل
نہ کوئی راہ بر میرا نہ کوئی راہ زن میرا

بہار آتے ہی مجھ کو اپنے ویرانے کی یاد آئی
خزاں جب تک رہی ، دل تھا نگہبانِ چمن میرا

بہانے اور بھی ہیں شامِ غم کے مسکرانے کو
رَوِش ! اب تذکرہ کرتی ہے کیوں صبحِ وطن میرا

(جنوری ۵۱ء)

حُسنِ روپوش، میری حسرتِ روپوش میں آ
یہی آغوشِ ازل ہے، اسی آغوش میں آ
قصّۂ طور کا عنوان بدل دے دنیا
کبھی اس طرح مری انجمنِ ہوش میں آ
دیکھنا گر ہے جمالِ رخِ لیلائے فراق
زلف بردوش! مری شام سیہ پوش میں آ
میری دنیائے محبت بھی کبھی ہو آباد
چشمِ حیراں، دلِ ویراں، لبِ خاموش میں آ
تیرے احساسِ تغافل کو خبر تک بھی نہ ہو
یوں بھی اک روز مری خلوتِ خاموش میں آ
اپنی بیگانہ نگاہی کا اثر دیکھ تو لے
رہزنِ ہوش ذرا تمکنتِ ہوش میں آ
تجھ پہ قربان مرے دل کی ہر اک بے خبری
آ! اسی منزلِ احساس فراموش میں آ
کب تک اے حسن پرستارئ آئینِ حجاب
جانِ آغوش! کبھی صورتِ آغوش میں آ
عشق وابستۂ زنجیرِ جنوں کب ہے روش!
حسنِ خود بیں کی تمنا ہے تو خود ہوش میں آ

(مارچ ۱۹۳۵ء)

ہمیں رسمِ سفر آئی نہ اندازِ قیام آیا
نہ جانے ہم کہاں ہوں گے، اگر اُن کا پیام آیا
بھری مینا سے کچھ بھر کچھ بِلائی چشمِ ساقی نے
بڑی رعنائیوں کے ساتھ مجھ تک دورِ جام آیا
دیارِ رنگ و نکہت میں گزر کیا ہوشمندوں کا
یہ پیغامِ بہار آیا تو دیوانوں کے نام آیا
ہزار افسانہ ہائے شوق، بیتابِ گزارش تھے
بڑی مشکل سے لب تک ایک حرفِ ناتمام آیا
شُبو، ہے شعلہ افشاں سایۂ دامانِ ساقی میں
لباسِ ہوش و تمکیں پھونک دینے کا مقام آیا
وہی رنگِ تغافل ہے وہی نازِ تغافل ہے
نہ جذبِ شوق کام آیا، نہ ترکِ شوق کام آیا
چراغِ صبح سے کچھ گفتگو تھی بے ثباتی پر
تصوّر میں یکایک چہرۂ خورشیدِ شام آیا

محبّت کو سنبھالا، بارہا تیرے تصوّر نے
رہِ ترک و طلب میں جب کوئی مشکل مقام آیا
دلِ خلوت نشیں الجھا رہا اپنے حجابوں میں
ہزاروں بار چھپ چھپ کر کوئی بالائے بام آیا
رَوِش سے اس بتِ خود بیں کو مصروفِ سخن پا کر
برہمن شکوہ بر لب پر در بیت الحرام آیا

(۱۹۴۶ء)

ربطِ پنہاں کی صداقت ہے نہ ملنا تیرا
تیرے ملنے ہی کی صورت ہے نہ ملنا تیرا

کیوں مرا شوقِ فراواں ہے یہ ہر لحظہ فزوں
کیا کوئی رازِ مشیّت ہے نہ ملنا تیرا

لالہ و گل مہ و انجم سے گلہ ہے کیا کیا
اور مقصودِ شکایت ہے نہ ملنا تیرا

زندگی کی شبِ غم حرف و حکایت میں کٹی
حاصلِ حرف و حکایت ہے نہ ملنا تیرا

کسی صورت، کسی عنواں سے تلافی نہ ہوئی
کس قدر تلخ حقیقت ہے نہ ملنا تیرا

اسی اندوہ میں دن بیت گئے ہیں کتنے
عمرِ رفتہ سے عبارت ہے نہ ملنا تیرا

کیا گلہ ہے مری محجوب محبت سے تجھے
کوئی در پردہ شکایت ہے نہ ملنا تیرا

زندگی نے ترے ملنے کا بہانا نہ سمجھا
ورنہ دراصل قیامت ہے، نہ ملنا تیرا

پھر بھی تیرے لئے آوارۂ غربت ہے روشؔ
گرچہ شایانِ محبت ہے نہ ملنا تیرا

(دسمبر ۵۰ء)

تماشائے بیتابیٔ دل نہ تھا — مرا حال، ہم رنگِ محفل نہ تھا
سرِ جادۂ زندگی، دل کا رُخ — تری سمت تھا، سوئے منزل نہ تھا
ترے عہد میں کیوں مٹایا گیا — وہ حرفِ محبت جو باطل نہ تھا
کہاں خود فراموشیوں سے نجات — تجھے بھول جانا تو مشکل نہ تھا
وہیں تک زبوں حال تھی زندگی — جہاں تک ترا درد شامل نہ تھا
یہاں، رہزن و رہنما ایک تھے — تری راہ میں کون حائل نہ تھا
مکمل تھی ہر شوخیٔ اجتناب — مرا جذبۂ دل ہی کامل نہ تھا
کُھلا یہ کہ شایانِ بادِ مراد — تلاطم ہی تھا امنِ ساحل نہ تھا

وہ اب سوچتے ہیں کہ حالِ روش
یہاں تک تغافل کے قابل نہ تھا

(سنہ ۴۹ء)

زندگی کیا ہے؟ حجابِ رخِ امکاں ہونا
پردۂ خاک میں چھپ چھپ کے گل افشاں ہونا
عالمِ حیرتِ نظّارۂ جاناں کی قسم
نگہِ شوق کی معراج ہے حیراں ہونا
عشرتِ دل نہیں اسبابِ طرب پر موقوف
آنسوؤں کو بھی تو آتا ہے غزل خواں ہونا
پرتوِ شوق ابھی حائلِ تنہائی ہے
ابھی کچھ اور ہے دل کو مرے ویراں ہونا

عشق نے جنّتِ فردا سے بھی منہ پھیر لیا
یاد آیا جو ترا زود پشیماں ہونا

سب حجابات ہیں اسرارِ خود آگاہی کے
کبھی قطرہ، کبھی دریا، کبھی طوفاں ہونا

آخرِ شب یہ ستاروں سے صدا آتی ہے
قسمتِ خوابِ تمنّا ہے پریشاں ہونا

دولتِ درد ہے کونین کا حاصل اے دل
کبھی بھولے سے نہ شرمندۂ درماں ہونا

آدمیت ہے فرشتوں سے بہت دور روش
واعظِ شہر کو دشوار ہے اِنساں ہونا

(اپریل ۳۶ء)

ہوس کو آگیا ہے گُل کھِلانا — ذرا اے زندگی! دامن بچانا
سُن اے شایانِ رازِ ہوش و مستی — سنبھلنے کی سزا ہے لڑکھڑانا
ہزار افسُردگی چیں بر جبیں ہو — نہ چھوٹے گا کلی کا مُسکرانا
تغافل کو کرم سمجھا ہے ہم نے — نہیں آساں ہمارا بھول جانا
خود آرائی ہے، اظہارِ محبت — خود آگاہی محبت کا چھپانا
کبھی شعلوں سی بڑھ بڑھ کر الجھنا — کبھی پھولوں سے بھی دامن بچانا
تمھیں دیر و حرم میں ڈھونڈتے ہیں — ذرا اہلِ نظر کا دل بڑھانا

فریبِ آرزو کی انتہا ہے — کسی افسردہ دل کا مسکرانا
غنیمت ہیں مری بربادیاں بھی — سکھایا ہے تجھے دامن بچانا
خلوصِ زندگی ہے کجکلاہی — فریبِ مصلحت ہے سر جھکانا
تری خودداریوں پر طنز بھی ہے — مرا اک اک قدم پر لڑکھڑانا

روشؔ! دیوانہ گر ہے چشمِ ساقی
سمجھ کر سوچ کر ساغر اٹھانا

(۴۸ء)

چلا ہے لے کے مجھے ذوقِ جستجو میرا
اب انتظار کر، اے جانِ آرزو میرا
میں بن سکا نہ ترا، یہ بجا سہی لیکن
کسی کو کیوں یہ گماں ہو نہیں ہے تو میرا
ہوائے دشت بہت دور لے گئی اکثر
نہیں اسیرِ چمن ذوقِ رنگ و بو میرا
شکستِ دل کی تلافی، نظر سے کیا ہوگی
ٹپک پڑے نہ تری آنکھ سے لہو میرا
بہار کی ستم آرائیوں کا ذکر نہ کر
یہ کم نہیں کہ گریباں ہے بے رفو میرا
مری غزل کے لئے کون منتظر ہے روشؔ!
پہنچ گیا ہی کہاں شوقِ گفتگو میرا

(کشمیر ستمبر ۴۰ء)

اے فسونِ التفاتِ ناز! یہ کیا کر دیا
پھر مجھے آوارۂ شہرِ تمنّا کر دیا

بھیجتا ہے کون چھپ چھپ کر پیامِ شوقِ دید
کس نے راتوں کو مری خوابِ زلیخا کر دیا

دل بہت شاداں ہے ٹھکرا کر متاعِ کائنات
زندگی حیران ہے کیا ہو گیا کیا کر دیا

چاکِ داماں وگریباں ہیں یہ اندازِ نمود
کس نے دیوانوں کو بھی اتنا خود آرا کر دیا

کیا یہی درمانِ غم تھا جس نے اے چشمِ کرم
اور بھی کچھ دردِ محرومی کو رسوا کر دیا

میری تنہائی تھی اک دنیائے ویراں کا حجاب
جانِ محفل! تو نے کیوں یہ راز افشا کر دیا

حسنِ خود بیں کو ازل سے تھی کسی کی جستجو
زندگی نے کیوں مری جانب اشارا کر دیا

حسن کے رخ پر تو اے منصور پردہ ہی رہا
عشق کی مجبوریوں کو تو نے رسوا کر دیا

کیوں وہ بیزارِ تمنّا ہے کہ جس نے اے روش
دل کے ہر ذرّے کو معمورِ تمنّا کر دیا

(۱۹۳۱ء)

وفا کو پردۂ محرومیٔ دوام کیا — تمام عمر ترے غم کا احترام کیا

انھیں نقاب اٹھانا بھی ہو گیا دشوار — کچھ اس طرح سے نگاہوں نے اژدہام کیا

خوشا، وہ دردِ محبت کہ جس نے خود بڑھ کر — دلِ حزیں کی تسلی کا اہتمام کیا

رہِ طلب میں کہاں امتیازِ دیر و حرم — جہاں کسی نے صدا دی، وہیں قیام کیا

ہزار جان فدا اُس شہید پر جس نے — تری نگاہ کو شمشیرِ بے نیام کیا

مزاجِ حسن کم آمیز، عشق کم اظہار — فسانۂ غمِ پنہاں کو کس نے عام کیا

خمارِ تشنگیٔ شوق کم نہ تھا اے دل — تمام عمر عبث انتظارِ جام کیا

دلِ روشؔ کو ترے انتظار نے اے دوست
چراغِ صبح کیا، آفتابِ شام کیا

(۱۹۴۶ مشاعرہ کانپور)

عشق آئینہ مرا، درد ہے شانہ میرا — حُسنِ پنہاں کی کہانی ہے فسانہ میرا

زندگی تشنۂ آغاز، فنا بے تکمیل — اب انھیں کون سنائے گا فسانہ میرا

اثرِ نالۂ خاموشِ محبت معلوم — جانتا ہوں کہ مرا دل ہے نشانہ میرا

ہاں کوئی ہو کہ نہ ہو، وجہِ تغافل اے دوست — بھولنے کے لئے کافی ہے بہانہ میرا

کیا شکایت مجھے ابنائے زمانہ سے روشؔ
محرمِ راز تھا کس روز زمانہ میرا

(۱۹۳۶)

کسی سے کام نہ رکھ ذوقِ جستجو کے سوا — کہیں قیام نہ کر شہرِ آرزو کے سوا

شبِ بہشت کا دیکھا ہے خواب واعظ نے — شبِ بہشت کہاں زلفِ مشکبو کے سوا

ملے گی کیا مرے ذوقِ نگاہ کو تسکین — بہار کیا ہے حجاباتِ رنگ و بو کے سوا

وہاں ہزار تغافل، شریکِ نازِ سکوت — ہزار شوق یہاں شوقِ گفتگو کے سوا

گمان بادۂ عشرت مرے سبو پہ نہ کر — ہے اس میں زہر بھی شامل مری لہو کے سوا

خطا معاف، مری لغزشوں کا محرمِ راز — کوئی نہیں، ترے لطفِ بہانہ جو کے سوا

ہے میکدے سے یہ کیوں تجھ کو اجتناب روشؔ
یہاں کچھ اور بھی ہے بادہ و سبو کے سوا

(۱۹۴۰)

جو ماورائے بیاں ہے، ہوا وہ حال مرا — یہ ابتدا ہے تو اے زندگی! مآل مرا

ترے جواب نے پہنچا دیا کہاں سے کہاں — بلند میری نظر سے نہ تھا سوال مرا

مری وفا سے زیادہ تری جفا کا خلوص — مجھے خیال جہاں ہے تجھے خیال مرا

کسے خبر کہ مشیت پہ کیا گزر جاتی — فروغِ دہر نہ ہوتا اگر زوال مرا

حریصِ عیش نہیں ہوں، مگر خوشی یہ ہے — تری نگاہ سے پنہاں رہا ملال مرا

سکوتِ ناز ہے کیوں اضطراب آمادہ — کچھ اس قدر تو پریشاں نہیں ہے حال مرا

روشؔ! یہ بزم مرے دردِ دل کو کیا سمجھے
حجاب ہے مری رعنائیٔ خیال، مرا

(مارچ ۱۹۴۱)

محبت میں فروغِ ما سوا کیا — تمنّاؤں نے دیکھے خواب کیا کیا
ہزاروں انقلاب آتے رہیں گے — بدل جائیں گے آدابِ وفا کیا
یہ پیمانِ خموشی ہے ابد تک — شکستِ دل سے نکلے گی صدا کیا
کمالِ ربطِ پنہاں دیکھتا ہوں — ملالِ اجتنابِ برملا کیا
بہت وسعت ہے دامانِ نظر میں — کسی کی کم نگاہی کا گلا کیا
سن اے گم کردۂ نا آشنائی — "ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا"
نشاطِ وعدۂ فردا بہت ہے — فراغِ خاطرِ اہلِ وفا کیا
بہت ڈھونڈو گے ہم کو ہم نہ ہوں گے — گریزاں ہم سے پھرتی ہے صبا کیا

روش اپنا ہی خوب و زشت سمجھو
زمانے کا بُرا کیا اور بھلا کیا

(جنوری ۵۱ء)

نہ جانے عشق کو منظور کیا تھا — وہ دامانِ گریزاں دور کیا تھا
شکستِ دل برائے عشرتِ دل — یہ تیرے عہد میں دستور کیا تھا
رہے دیر آشنا شیخ و برہمن — صنم خانہ حرم سے دور کیا تھا
نہ دنیا بھی کچھ ایسی شادماں تھی — دلِ رنجور بھی رنجور کیا تھا
حرم تک ایک خاموشی ہی طاری — یہ بتخانے میں کل مذکور کیا تھا

روش کس سے بھری محفل میں کہتے
کہ اہلِ راز کا دستور کیا تھا

(نومبر ۴۸ء)

بڑی مدت میں اہلِ ہوش نے اس دل کو پہچانا
کہ جس نے رنگِ طوفاں دیکھ کر ساحل کو پہچانا
نہ سوزِ غم کو سمجھا اور نہ دردِ دل کو پہچانا
کہاں دنیا نے حسن و عشق کی محفل کو پہچانا
یہ کہتا ہے تاملؔ، اُن کی دزدیدہ نگاہوں کا
کہ در پردہ کسی کے اضطرابِ دل کو پہچانا
رہا نا آشنا، جن کا تصور رہ نماؤں سے
انھیں گم گشتگانِ شوق نے منزل کو پہچانا
مجالِ حق شناسی ہے یہاں کس کو، مگر واعظ
تجھے دیکھا تو ہر اندیشۂ باطل کو پہچانا
تری آنکھوں میں دیکھا ایک افسونِ خود آگاہی
اُس افسونِ خود آگاہی سے میں نے دل کو پہچانا
ہمیں پہچان لو، اے رہروانِ وادیٔ الفت
کہ ہم نے نقشِ پائے رہبرِ کامل کو پہچانا
رَوِش! یہ اہلِ ظاہر محرمِ آدابِ الفت ہیں
یہ عذرِ بے گناہی کیوں مرے قاتل کو پہچانا

امتیازِ خیر و شر ہونے لگا تنگ دامانِ نظر ہونے لگا
زندگی کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ کارِ دنیا مختصر ہونے لگا
رات بھر اشکوں کو روکا صبحدم کارواں گرمِ سفر ہونے لگا
یہ بھی ہے شاید فریبِ آگہی کون تجھ سے بے خبر ہونے لگا
صبحِ منزل کا درخشاں آفتاب کیوں چراغِ رہ گزر ہونے لگا
رفتہ رفتہ حسرتِ تعمیر کو شکوۂ دیوار و در ہونے لگا
دم بہ دم حسنِ تغافل ہے فزوں جذبۂ دل کارگر ہونے لگا
دیدہ و دل کی خود آگاہی گئی انتظارِ راہبر ہونے لگا
دور پہنچے نالہ ہائے نیم شب چاکِ دامانِ سحر ہونے لگا

میں تو ہوں گم کردۂ دل اے روشؔ
کون میرا ہم سفر ہونے لگا

(مئی ۱۹۵۶)

ذوقِ یقین نے کفر کو ایماں بنا دیا
جس در پہ سر جھکا درِ جاناں بنا دیا
زاہد حدودِ ہوش و خرد میں رہا اسیر
ناداں نے زندگی ہی کو زنداں بنا دیا
حُسنِ خلوصِ لغزشِ آدم تو دیکھیے
ویرانۂ جہاں کو گلستاں بنا دیا

کیا آئینے کا ذکر ہے اس خوش جمال نے
جس پر نگاہ کی اُسے حیراں بنا دیا
اُس راز کو جو قلبِ ازل میں نہ چھپ سکا
آخر، امانتِ دلِ انساں بنا دیا
ہم بے نیازِ چارہ گری ہیں کہ عشق نے
درماں کو درد، درد کو درماں بنا دیا
کیا کیا خیال زینتِ آغوشِ شوق تھے
تم نے تو سب کو خوابِ پریشاں بنا دیا
یہ بھی کسی کا حُسنِ کرم ہے کہ اے روشؔ
غم ہی کو چارۂ غمِ پنہاں بنا دیا

(۱۹۲۷ء)

ابھی خاکِ چمن کو ہے خود اپنا راز داں ہونا
خزاں کا سوزِ دل لے کر، چمن کا پاسباں ہونا
حجاباتِ خزاں سے چہرۂ گلشن، نکھرتا ہے
کم آگاہی ہے ممنونِ بہارِ جاوداں ہونا
غروبِ مہر سے، ڈوبے ہوئے تارے اُبھرتے ہیں
حیاتِ سرمدی کیا ہے، عیاں ہو کر نہاں ہونا
ٹھہر اے جادہ پیما، رازِ منزل تجھ کو سمجھا دوں
غبارِ کارواں ہونا ہے، خضرِ کارواں ہونا

یہ کیوں رقصِ صبا پر لالہ و گل چاک داماں ہیں
زرا کچھ سوچ کر اہلِ جنوں سے بد گماں ہونا

قفس کی زندگی کا ذکر ہی کیا، ننگِ ہستی ہے
مگر اے ہم نشیں! کیا ہے اسیرِ آشیاں ہونا

زمانے کی نگاہوں میں کھٹک کر جی تو سکتے ہیں
مگر ہے موت اپنی ہی نگاہوں پر گراں ہونا

یہ دولت وسعتِ فکر و نظر سے ہاتھ آتی ہے
ہستیٔ ہر آب جو کا ظرفِ بحرِ بیکراں ہونا

رَوِش! کیا شکوۂ نامہربانی، عصرِ حاضر سے
جہانِ مہرباں کیا ہے، خود اپنا مہرباں ہونا

(اگست ۶۴۹)

تذکرہ رہتا ہے دل سے سحر و شام اُن کا
لب تک آجائے نہ بھولے سے کہیں نام اُن کا

زندگی کیوں ہمہ تن گوش ہوئی جاتی ہے
کبھی آیا ہے جو، اب آئے گا پیغام اُن کا

حسرتِ دید رہی خلوتِ دل میں روپوش
اور دیدار خدائی میں رہا عام اُن کا

دور پہنچا مرا قصہ، کہ بڑی حسرت سے
شکوہ کرتی تھی فلک سے شفقِ شام اُن کا

ملتفت ہو نہ سکے، گم شدگانِ الفت
خود ہی تکتی رہی منہ گردشِ ایام اُن کا

ہم کو شکوہ تو نہیں شیخ و برہمن سے مگر
بے غرض کفر ہی اِن کا ہے نہ اسلام اُن کا

جام و مینا سے اُلجھتے ہیں جو میخوار رَوِش!
مسلکِ بادہ پرستی ہی بہت خام اُن کا

(۶۴۲)

خیال و خواب تھا اے ہم نشیں فسانہ تھا
نہ ہم چمن میں کبھی تھے، نہ آشیانہ تھا
یہ سوچتا ہوں کہ اخفائے شوق ہی شاید
تغافلِ نگہہ ناز کا بہانہ تھا
اداس اداس خزاں تک رہی تھی حسرت سے
چمن سے قافلۂ رنگ و بو روانہ تھا
غلط نہیں ہیں زمانے کے شکوہ ہائے دراز
وہاں سے دور رہے ہم جہاں زمانہ تھا
حرم سے لا کے جلائی ہے شمع واعظ نے
بجھا بجھا سا چراغِ شراب خانہ تھا
تجھے خبر نہ ہوئی اور جل کے خاک ہوا
وہ دل جو تیری محبت کا آشیانہ تھا
لگی تھی آج درِ میکدہ پہ بھیڑ روش
کسی کا ذکر نہیں ہے وہاں زمانہ تھا

اُس سے بڑھ کر تو کوئی بے سروساماں نہ ملا
دل ملا جس کو، مگر دردِ غریباں نہ ملا
تلخیٔ بادۂ اندوہِ وفا، کیا کم ہے؟
اس میں اے دوست! یہ زہرِ غمِ دوراں نہ ملا
اک ذرا ذوقِ تجسّس میں بڑھایا تھا قدم
نکہتِ گل کو پھر آغوشِ گلستاں نہ ملا
کر لیا ہم نے گوارا غمِ آشفتہ سری
جب کسی طرح مزاجِ دلِ خوباں نہ ملا
اب کہاں جائیں بتاؤ تو کچھ اے اہلِ حرم
بُت کدے میں بھی وہ غارت گرِ ایماں نہ ملا
نسبتِ پائے نگاریں ہے یہ اے موجِ نسیم
خاک سے سلسلۂ لالہ و ریحاں نہ ملا
بات اتنی سی ہے اے واعظِ افلاک نشیں
کیا ملے گا اُسے یزداں، جسے انساں نہ ملا
اُن سے اب تذکرۂ دولتِ کونین ہے کیوں؟
جن غریبوں کو ترا گوشۂ داماں نہ ملا
جرعۂ بے خبری، حاصلِ میخانہ ہے
غم نہ کر تجھ کو اگر ساغرِ عرفاں نہ ملا

خوبیٔ دولت و دانش پہ نظر ہے سب کی
کوئی اس دور میں دلدادۂ انساں نہ ملا
زندگی نام ہے طوفانِ حوادث کا روشؔ
ننگِ ساحل ہے وہ جس کو کوئی طوفاں نہ ملا

(۶۵۳)

ہجومِ تمنّا سے کیا ہو گیا
وہ کچھ اور نا آشنا ہو گیا

وہیں لٹ گیا، کاروانِ حیات
جہاں سے ترا غم، جدا ہو گیا

پشیماں نگاہوں کا رنگِ سکوت
خود اک داستانِ وفا ہو گیا

چلے تھے زمانے سے منہ پھیر کر
یکایک ترا سامنا ہو گیا

یہاں ایک سے ایک ہے اجنبی
الٰہی زمانے کو کیا ہو گیا

تغافل میں بھی اس قدر احتیاط
تری بے نیازی کو کیا ہو گیا

نہ آیا جسے شیوۂ زندگی
وہی زندگی سے خفا ہو گیا

وہ پچھلے پہر میکدے کا طواف
روشؔ ان دنوں خواب سا ہو گیا

کھلے نہ راز کہیں، اے نگاہِ یار مرا
کہ اب نہیں دلِ ناداں پہ اختیار مرا

جو آشنا نہیں مجھ سے، وہ میرا قاصدِ شوق
جو مجھ کو بھول گیا ہے وہ رازدار مرا

خزاں کے ساتھ بہت دور مجھ کو جانا ہے
نہ انتظار کرے محفلِ بہار مرا

عروسِ شب نے نسیمِ سحر کے کیا پھونکا
کہ تذکرہ ہے ہر اک گل سے بار بار مرا

کہاں نجات محبت کو بدگمانی سے
نہ اعتبار تمھارا نہ اعتبار مرا

بہت حزیں ہوں زمانے کی غمگساری سے
تجھے بھی پاس ہے کچھ اے خیالِ یار مرا

روشؔ! یہ مژدۂ نو خواب ہے کہ بیداری
کہ ہے دیارِ زلیخا کو انتظار مرا

(سری نگر کشمیر ۱۹۴۰ء)

آسرا وہ بھی شامِ فرقت کا
خواب تو دیکھئے محبت کا

دلِ خوددار میں بھی ہے اے دوست
وہی عالم تری نزاکت کا

حرفِ شکوہ کی نارسائی تک
لطف تھا شکوۂ و شکایت کا

وہ قفس ہو کہ آشیانہ ہو
اک بہانہ ہے خوابِ غفلت کا

شبِ مہتاب ہو کہ صبحِ بہار
پیرہن ہے تری لطافت کا

عشق خود رفتہ، حسن کم آمیز
رنگ ہے انجمن میں خلوت کا

تجھ کو اے شوخیٔ تغافلِ ناز
کیا بہانہ ملا قیامت کا

ہو گئی پھر روشؔ کی حالت غیر
نام کس نے لیا محبت کا

(فروری ۱۹۴۲ء)

لُطف بھی اُس نے باندازۂ بیداد کیا
ہائے اس سادگیٔ ناز نے برباد کیا
اک نئی لہر ہے بیتابیٔ دل میں شامل
شاید آج اس کے تغافل نے مجھے یاد کیا
زندگی نے غمِ دوراں کا سہارا لے کر
دلِ ناشاد کو کچھ اور بھی ناشاد کیا
یہی لذّت کشِ آزارِ ستم تھا اے دوست
دل ستم گر ہے کہ تجھ کو ستم ایجاد کیا
اُس کی خاموش نگاہوں میں وہ غم تھا روپوش
جس نے خود عشق کو آمادۂ فریاد کیا
حسن سے کس کو یہاں شکوۂ بربادی ہے
کون برباد ہوا ہے کسے برباد کیا
جام و مینا کا بھی کچھ ہوش نہیں مستوں کو
آج کیا نرگسِ مخمور نے ارشاد کیا
ہم ازل سے ہیں گرفتارِ غمِ عشق روشؔ!
ہم کو ہر غم سے غمِ عشق نے آزاد کیا

(۱۹۳۴ء)

بر درِ میخانہ، ابرِ خوش خرام آہی گیا
میکشو اُٹھو! کہ ہنگامِ قیام آہی گیا

لوٹ اے خورشیدِ رفتہ، جاگ اے شمعِ خموش
وہ مرادِ انتظارِ صبح و شام آہی گیا

کاروانِ شوق میں بڑھنے لگے آثارِ ہوش
خضر سے دامن بچانے کا مقام آہی گیا

لڑکھڑا کر ساقیٔ مخمور نے بخشا ہے جام
امتحانِ ہوش و مستی کا مقام آہی گیا

کب تک اُن آنکھوں کی خلوت میں رہی گا رازِ عشق
جنبشِ مژگاں کو اندازِ کلام آہی گیا

التفاتِ چشمِ ساقی، زہر آلودہ سہی
زندگی! مژدہ، کہ مجھ تک دورِ جام آہی گیا

شاد باش! اے دل کہ آخر تیری بربادی کے بعد
اپنے مرکز پر زمانے کا نظام آہی گیا

تذکرہ تھا، جاں نثارانِ محبت کا رَوِش
اُن کے لب پر اپنے دیوانے کا نام آہی گیا

(مشاعرہ میرٹھ ۴۵ء)

طوافِ نقشِ پائے خضر سے بہتر ہے مرجانا
مبارک، عشق کو آدابِ منزل سے گزر جانا

جلا کر اک چراغِ ترکِ دُنیا تو نے اے زاہد
فروغِ زندگی کو آہ کتنا مختصر جانا

مجھے چشمِ خمار آلود سے دیکھا ہے ساقی نے
یہیں کچھ دیر تک اے گردشِ دوراں ٹھہر جانا

تغافل کی شکایت کیا کہ اربابِ محبت نے
نہ تجھ کو بے خبر سمجھا نہ دل کو باخبر جانا

ہمیں دیر و حرم کے تفرقوں سے کام ہی کیا ہے
سکھایا ہے کسی نے، اجنبی بن کر گزر جانا

خدا جانے، کہاں لے جائے ذوقِ آگہی اُسکو
کہ جس نے حُسن کو بھی حسنِ اندازِ نظر جانا

بڑی حسرت سے تجھ کو تک رہی ہیں چھاؤں تاروں کی
ذرا اے کاروانِ وادیٔ فرقت ٹھہر جانا

روش اک دل نشیں تفسیرِ نازِ حُسن برہم ہے
بکھرنا اور بکھر کر زلفِ گیتی کا سنور جانا

(اگست ۱۹۵۱ء)

آزردہ جو وہ زود پشیماں نظر آیا — شیرازۂ کونین پریشاں نظر آیا
غم ہی سے تلافی ہوئی آخر غمِ دل کی — مجبور یہاں، عالمِ امکاں نظر آیا
کس درجہ سکوں بخش ہے احساسِ محبت — ہر درد کے آغوش میں درماں نظر آیا
مومن کا تو کیا ذکر ہے اس دیرِ کہن میں — کافر بھی مجھے بندۂ یزداں نظر آیا
وہ سامنے نقشِ قدمِ دوست ہے شاید — حاصل ترا اے عمرِ گریزاں نظر آیا
ہم کو تو گریباں سے رہا کام جنوں میں — صحرا نظر آیا نہ گلستاں نظر آیا
اے خسروِ خوباں! یہ پریشاں نظری کیوں — کیا ہے، جو کوئی بے سر و ساماں نظر آیا

منہ پھیر لیا ہم نے روشؔ، صبحِ وطن سے
کیا خواب سرِ شامِ غریباں نظر آیا

(اکتوبر ۲۹ء)

ہزار حسنِ دلآرائے دو جہاں ہوتا — نصیبِ عشق نہ ہوتا تو رائیگاں ہوتا
ترے فراق نے کیا کیا دکھائے ہیں عالم — ترا فراق ہی اے کاش جاوداں ہوتا
جو میں کرم نہ سمجھتا ترے تغافل کو — تو بار بار یہ دل مجھ سے بدگماں ہوتا
ہزار طور نگاہوں نے کر لئے پیدا — حجابِ شوق بھی حائل کہاں کہاں ہوتا
مجھے تلاشِ سکوں تھی، مگر سوالِ سکوں — نزاکتِ نگہِ ناز پر گراں ہوتا
بپاسِ ناز اگر خود وہ روبرو ہوتے — تو پردۂ نگہِ شوق درمیاں ہوتا
نہ دشمنوں کا ستم تھا نہ دوستوں کا کرم — زمانہ کاش پھر اک بار مہرباں ہوتا

روشؔ! قفس ہی کو ہم آشیاں بنا لیتے
اگر خیال میں بھی خوابِ آشیاں ہوتا

(دسمبر ۳۴ء)

دل نے خود، جبر اختیار کیا — ایک ناآشنا کو پیار کیا
حد سے گزرا گناہِ تشنہ لبی — چشمِ ساقی کو اشکبار کیا
عشق نے حُسن امتزاج کے ساتھ — رنج و راحت کو خوشگوار کیا
ہائے، ہر کوششِ تسلی نے — اور بھی دل کو بے قرار کیا
اے پشیمانِ وعدۂ فردا — کیوں کسی کو امیدوار کیا
زُہد نے خرقۂ خزاں آلُود — نذرِ میخانۂ بہار کیا
کیا وہ شایانِ دید ہو جس نے — دیدہ و دل کا اعتبار کیا
ہم سے ان سب بتانِ خود بیں نے — ذکر تیرا ہزار بار کیا

تُو نے ہی منہ سے کچھ کہا نہ رَوش
حشر تک اُس نے انتظار کیا

(جولائی ۴۵ء)

رنگ اس محفلِ تمکیں میں جمایا نہ گیا
خامشی سے بھی مرا حال سنایا نہ گیا
وحشتِ دل نے حجاباتِ جہاں چاک کئے
ایک پردہ رُخِ جاناں سے اٹھایا نہ گیا
عشق، اک داغ سہی دامنِ ہستی پہ مگر
خود مشیت سے بھی یہ داغ مٹایا نہ گیا
کر دیا دفترِ ہستی تو پریشاں دل نے
مگر اک خوابِ پریشاں کو بھلایا نہ گیا

وہ اندھیرا تھا کہ ہنگامِ سحر بھی ہم سے
شمعِ اندوہِ جدائی کو بجھایا نہ گیا
سرحدِ عشق سے آگے نہ بڑھی وحشتِ عشق
حُسنِ ہشیار کو دیوانہ بنایا نہ گیا
لاکھ عنواں سے بھلانا انھیں چاہا تھا روشؔ
کسی عنواں سے مگر اُن کو بھُلایا نہ گیا

(غالباً اکتوبر سنہ ۳۰ء)

التفات آشنا حجاب ترا — لطفِ پنہاں ہے اجتناب ترا
کیا ملا ہے مآلِ بیداری — میری آنکھیں ہیں اور خواب ترا
دل سے کرتا ہوں لاکھ لاکھ سوال — یاد آتا ہے جب جواب ترا
کوئی دیکھے تجھے تو کیا دیکھے — کہ ترا حسن ہے نقاب ترا
ہائے اُن لغزشوں کی رعنائی — ڈھونڈتا ہے جنھیں عتاب ترا
عشرتِ دل تھی، دل کی بربادی — ٹوٹ کر بن گیا رباب ترا
کس سے پوچھیں کہ اب کہاں ہے روشؔ
ہائے وہ خانماں خراب ترا

(سنہ ۱۹۲۸ء)

دل کو احساسِ زیاں ہونے لگا — کیا زمانہ مہرباں ہونے لگا
تجھ سے مل کر ایک مبہم سا خیال — رفتہ رفتہ جاوداں ہونے لگا
جس کو ہونا دائیِ دل کا یقیں — کیوں کسی سے بدگماں ہونے لگا
یہ تو تھے شاید بہار آنے کے دن — باغباں کیوں سرگراں ہونے لگا
تھک کے بیٹھے تھے اِدھر ہم اُس طرف — جادہ پیما کارواں ہونے لگا

اب خلوص و دوستی پر بھی روش!
وضع داری کا گماں ہونے لگا

یہ کون مسندِ خلوت سے مستِ خواب اُٹھا
کہ جھانکتا ہوا مشرق سے آفتاب اُٹھا
نہ دیکھنے دیا کچھ مجھ کو فرطِ حیرت نے
ہزار پڑ گئے پردے جو اک حجاب اُٹھا
تکلفات کو بالائے طاق رکھ، مطرب،
میں دل سے ہاتھ اٹھاتا ہوں تو رباب اُٹھا
یہ کس کو ڈھونڈتا پھرتا ہے دردِ تنہائی،
کس انجمن سے دلِ خانماں خراب اُٹھا
کوئی حجابِ نظر تھا جو اُٹھ گیا ہوگا
کہاں کسی سے ترا گوشۂ نقاب اُٹھا

مثالِ آبِ رواں ، با وقار و تمکیں بن
سکوں کا نام نہ لے ، قیدِ اضطراب اُٹھا
وہ رندِ محرمِ اسرارِ میکدہ ہے روشؔ
جو بزمِ عیش سے بادیدۂ پُرآب اُٹھا

(سنہ ۱۹۲۶ء)

ذکر سُن سُن کے صبا سے ترے دیوانوں کا
اُڑ گیا رنگ گلستاں کے نگہبانوں کا
ابھی آزادیٔ انساں ہے ، فریبِ انساں
دلِ انساں ہے نشانہ ابھی افسانوں کا
صاف کہنے پہ ہوں مجبور ، سُن اے بادِ صبا
تیرے گلشن پہ ہے سایہ ابھی زندانوں کا
کس کے دل کا تھا لہو ، جس کو چھپانے کے لئے
خاکِ گیتی نے بھرا روپ گلستانوں کا
ایک دھندلی سی کرن ہے ابھی تاریکی میں
شمع کے دل میں ابھی درد ہے پروانوں کا
بارہا عشق کی ٹوٹی ہوئی کشتی نے روشؔ
سر جھکایا ہے اُبھرتے ہوئے طوفانوں کا

(مارچ سنہ ۴۸ء)

ب

فرصتِ شوق کی کوئی نہیں حد اے محبوب
لمحہ لمحہ ہے ازل اور ابد اے محبوب

رنگِ تغیّر سے آزاد ہے کیفیّتِ عشق
اس میں شامل نہ جنوں ہے نہ خرد اے محبوب

کیا کہوں کس کو وہاں محوِ فغاں دیکھا ہے
ختم ہوتی ہے جہاں ضبط کی حد اے محبوب

پردۂ چاک گریباں میں ترے دیوانے
چاک کرتے ہیں حجاباتِ خرد اے محبوب

عشق تنہا سہی بے کس سہی ، بے زور سہی
کیوں ترے اشک ہیں بنیادِ مدد اے محبوب

ہے یہ اعجازِ محبّت کہ محبّت کے خلاف
خود ہر اک بات ہوئی جاتی ہے رد اے محبوب

عشق نے شرک کی پستی سے بچایا مجھ کو
عشق ہے شرح ہو اللہُ احد اے محبوب

سروِ شمشاد کا ایماں ہے کہ لاریب و گماں
ختم ہے تجھ پہ دلآویزیٔ قد اے محبوب

سرنگوں عالمِ اسباب و مظاہر ہے یہاں
خود محبّت ہے محبّت کی سند اے محبوب

نذر کرتا ہوں ترا وعدۂ فردا تجھ کو
کہیں یہ نذر بھی ہو جائے نہ ردِ محبوب
تو نے بخشی ہے رَوش کو غمِ دل کی دولت
کیوں نہ ہو عیشِ دو عالم کو حسد اے محبوب

(نومبر ۴۱ء)

ت

یوں تو دشوار ہے زاہد رہِ میخانہ بہت
رہ نما دل ہو تو اک لغزشِ مستانہ بہت

دور ہی دور زرا اے کششِ دیر و حرم
ہے کم آمیز، گدائے درِ جانانہ بہت

عرصۂ دہر بھی تیرے لئے کم اے واعظ
اور میرے لئے اک گوشۂ میخانہ بہت

سرد، اس دَور میں ہے سینۂ آدم ورنہ
زندگی کے لئے سوزِ دلِ پروانہ بہت

برملا کس نے کیا تذکرۂ تشنہ لبی
آج مغرور ہے کیوں نرگسِ مستانہ بہت

کوئی نسبت نہ ہو ساقی سے تو میخانہ بھی خاک
لطفِ ساقی ہو تو خاکِ درِ میخانہ بہت

یوں حرم میں بھی سکونِ دلِ شوریدہ کہاں
یہ تسلی ہے کہ نزدیک ہے بتخانہ بہت

ہم کہاں جائیں بیابانِ محبت سے رَوش
خاک اڑانے کے لئے ہے یہی ویرانہ بہت

(دسمبر ۵۱ء)

لبِ مینا پہ تھی کس شوخ کی بات
بہک نکلے ہیں زندانِ خوش اوقات
وہاں ہیں اب اسیرانِ خرابات
جہاں ہے ہر قدم کشف الحجابات
زمانہ تھا نہ اربابِ زمانہ
یہ کس عالم میں گزرے چند لمحات
جہانِ صورت و معنیٰ کی زینت
یہی ہیں کچھ پریشاں سے خیالات
جب انساں اپنی جانب دیکھتا ہے
لرز جاتا ہے زندانِ محالات
زباں چُپ ہے مگر خاموش آنکھیں
کہے دیتی ہیں صدیوں کی حکایات
کہاں ہیں اب مری پلکوں پہ آنسو
یہ کیوں افسردہ ہے تاروں بھری رات
رَوِش جادو تو کیا ہوتا غزل میں
مگر خوباں سے تقریبِ ملاقات

(جولائی ۶۵۲)

زندگی پر، ہے گمانِ سایہ گیسوئے دوست
سانس لیتا ہوں تو ملتا ہے سراغ بوئے دوست
گردشِ ایام، منہ تکتی ہے میرا، اور میں
چومتا جاتا ہوں، آنکھوں سے غبار کوئے دوست
جذبِ دل کا ہے یہی عالم تو اک دن دیکھنا
خضر دیوانوں سے پوچھیں گے نشانِ کوئے دوست
یاد آتا ہے کہ شاید خواب دیکھا تھا کوئی
ہم کہاں اے دردِ تنہائی کہاں پہلوئے دوست

رابطہ محکم ہو تو کیا ترکِ علائق کا سوال
چشمِ عالم سوئے دل ہے، چشمِ دل ہے سوئے دوست

طعنہ زن تھا ناصحِ ناداں غریبِ عشق پر
یک بیک ہر سمت سے آنے لگی خوشبوئے دوست

لغزشِ پیہم نے آخر دستگیری کی روش!
بے تکلف بڑھ گئے میری طرف بازوئے دوست

تغافل خود ہے اقرارِ محبت
یہ خاموشی ہے گفتارِ محبت

نہاں ہو یا نمایاں ہو بہر طور
محبت ہے سزاوارِ محبت

دلِ مہتاب ہو یا چشمِ انجم
نہیں ہے کون بیمارِ محبت

وہ لغزیدہ نگاہیں کہہ رہی ہیں
دلِ نازک پہ ہے بارِ محبت

ز سر تا پا محبت بن گئے ہو
یہی ہوتا ہے انکارِ محبت

تمنّائیں ہوئی جاتی ہیں روپوش
کھلے جاتے ہیں اسرارِ محبت

شبستانِ ارم سے کھینچ لائی
نسیمِ صبحِ گلزارِ محبت

یہ کیا جانیں وہ رم خوردہ نگاہیں
روش بھی ہے گرفتارِ محبت

(سنہ ۴۱ء)

خواب ہوئی وہ عشق کی جنت، ہائے مرا آغازِ محبت
تلخ نہ تھا جب زہرِ مسرت ہائے مرا آغازِ محبت
پائے خرد آمادۂ لغزش، گوشۂ تمکیں مائلِ گردش
ہلکا ہلکا نشّۂ الفت، ہائے مرا آغازِ محبت
خاموشئ ہم رنگِ ترنّم، اشک آنکھوں میں لب پہ تبسّم
سوز میں تسکیں، درد میں راحت، ہائے مرا آغازِ محبت
بادِ نشاط کے پیہم جھونکے، آہ وہ شاداں شاداں لمحے
اک دنیا اور لاکھوں جنت، ہائے مرا آغازِ محبت
صبح سے دامنِ شب پیوستہ، شب سے عجب عالم وابستہ
خواب تھا ہر اندیشۂ فرقت، ہائے مرا آغازِ محبت
رنگِ غرورِ شوقِ فراواں، حسنِ وفا پر آپ ہی نازاں
خود ہی تغافل خود ہی شکایت، ہائے مرا آغازِ محبت
پائے تمنّا میں زنجیریں، اُن کو بھلانے کی تدبیریں
عشق کی وہ معصوم بغاوت، ہائے مرا آغازِ محبت
اکثر آپ ہی چپ چپ رہنا، دل کا درد کسی سے نہ کہنا
ضبط کی شدّت، غم کی نزاکت، ہائے مرا آغازِ محبت
لاکھ بہانوں سے وہ بھلانا، لاکھ طرح اُن کا یاد آنا
اپنی شکست پہ خود ہی مسرت، ہائے مرا آغازِ محبت

یاد کی شدّت خاموشی میں، رنگِ تمنّا مدہوشی میں
کس سے چھپے اظہار کی صورت، ہائے مرا آغازِ محبّت

وادیٔ غم پر گوہر افشاں، اُمّیدوں کا ابرِ خراماں
زینتِ مژگاں اشکِ مسرت، ہائے مرا آغازِ محبّت

انبوہِ گُل ہائے تغافل، عطر فشاں خوش بوئے نوازش
مہکی مہکی عشق کی خلوت، ہائے مرا آغازِ محبّت

ضبط کی بات کہاں بنتی ہے تابشِ شوق کہاں چھپتی ہے
عشق سے بڑھ کر حُسن کی حالت، ہائے مرا آغازِ محبّت

ہائے روشؔ یوں رُسوا ہونا، اور ابھی ہے کیا کیا ہونا؟
کل کا راز ہے آج حکایت، ہائے مرا آغازِ محبّت

(۱۹۴۳ء)

ث

ہاں سمجھتا ہوں سکوتِ شبِ غم کا باعث
مگر، آہ شگفتگیِ زلفِ صنم کا باعث

کچھ یہاں ہے نہ وہاں جلوۂ جاناں کے سوا
آخر اس کش مکشِ دہر و حرم کا باعث

سب محبت کو زبوں حال سمجھتے ہیں، مگر
کس کو معلوم تری ترکِ ستم کا باعث

دیکھتا ہوں تری آنکھوں میں نشاطِ ابدی
سوچتا ہوں، نہ کھلے گا مرے غم کا باعث

مری ہر سانس روشِ غم زدۂ عشق سہی
کیوں مرا غم ہو کسی حسنِ کرم کا باعث

ج

غمِ جاناں ہی سے ہوگا غمِ جاناں کا علاج
درد ہی درد ہے، اس دردِ فراواں کا علاج

اب یہ سنتا ہوں کہ ہے بوئے گل آوارۂ ہوش،
خوب سوچا تھا، میرے حالِ پریشاں کا علاج

نہ سہی تاب، مگر جلوۂ پیہم کے سوا
کیا ہے اے دوست! مرے دیدۂ حیراں کا علاج؟

بے نیازانہ تبسم کے سوا، اے ہمدم
کچھ نہیں تلخیِ زہرِ غمِ دوراں کا علاج

دلِ شوریدہ، کسی طرح بہل جائے گا
مگر آشفتگیٔ زلفِ پریشاں کا علاج

کون سمجھائے کہ اے واعظِ محدود نظر
زہدِ افسردہ نہیں، آتشِ دوراں کا علاج

چارۂ دردِ نہاں، چاکِ گریباں ہی سہی
نگہِ ناز! مگر چاکِ گریباں کا علاج

چل روِشِ جانبِ بتخانہ، پس و پیش نہ کر
وہیں ہوگا ترے اندیشۂ ایماں کا علاج

ح

جب سے دیکھی ہے ترے شعلۂ رخسار کی صبح
صبحِ جنت سے نہیں کم، کسی مے خوار کی صبح

آج بھی نقشِ گروہم و گماں ہے دُنیا
وہی انکار کی راتیں، وہی اقرار کی صبح

تجھ کو اس وقت ہے کیوں، جلوہ نمائی سے گریز
صبحِ فردا تو نہیں ہے ترے بیمار کی صبح

رات تو کشمکشِ دیر و حرم میں گزری
درِ جاناں پہ ہوئی کافر و دیندار کی صبح

نیم خوابی کا سا عالم ہے مسلسل طاری
چھپ گئی جا کے کہاں نرگسِ بیمار کی صبح
زلف و رخسار کے سائے ہیں درخشاں ہیں روشؔ
دلِ بیدار کی راتیں، دلِ بیدار کی صبح

(۱۹۴۱ء)

خ

تھا بہت ذوقِ شادمانی تلخ
ہو گئی اور زندگانی تلخ
سُنّنے والے بھی تلخ کام ہوئے
کس قدر تھی مری کہانی تلخ
زہر بنتی گئیں تمنّائیں
اور ہوتی گئی جوانی تلخ
غمِ دل خوشگوار تھا جس کو
کر گئی تیری مہربانی تلخ
ابتدا شہد آفریں ہے روشؔ!
مگر انجامِ شادمانی تلخ

(اکتوبر ۱۹۵۲ء)

د

پشیماں ہیں ترکِ محبت کے بعد
بڑھیں الجھنیں اور فرصت کے بعد

ابھی تو قیامت کا ہے آسرا
خدا جانے کیا ہو قیامت کے بعد

یہ حُسنِ خلوصِ شکایت بجا
مگر کیا رہے گا شکایت کے بعد

وہ ہر بار ملتے ہیں اس شان سے
ملے جس طرح کوئی مُدّت کے بعد

کسے کہنے سننے کا کچھ ہوش تھا
کہیں ہم نہ تھے حرفِ رخصت کے بعد

محبت سے پہلے یہ عالم نہ تھا
کہاں آ گئے ہم محبت کے بعد

نہ صبحِ قیامت نہ صبحِ وصال
یہاں کچھ نہیں شامِ فرقت کے بعد

بہت شوقِ حرف و حکایت رہا
خموشی ہے حرف و حکایت کے بعد

رَوِش یہ خوش آہنگ رنگِ غزل
دل آویز ہے رنگِ حسرت کے بعد

کیا ہوا ہے کوئی احساسِ زیاں میرے بعد
ہے بہت سُست قدم، عمرِ رواں میرے بعد

خاک آلودۂ اوہام ہے، دامانِ نظر
بُجھ گئی مشعلِ رخسارِ بتاں میرے بعد

تھا یقیں کس کو کہ دنیائے وفا میں ہوگا
ہر کہانی پر حقیقت کا گماں میرے بعد

جن سے چھوٹا نہ کبھی گوشۂ تمکین و حجاب
وہی آنکھیں ہیں بہ ہر سو نگراں میرے بعد

کون سنتا تھا یہاں حالِ غمِ دل لیکن
ہمہ تن گوش ہیں سب اہلِ جہاں میرے بعد

مہ و انجم بھی تو مجروحِ محبت ہیں روشؔ!
تیر پھینکے ہیں محبت نے کہاں میرے بعد

(جنوری ۵۳ء)

ہم میکشوں کے قدموں پہ اکثر
جھک جھک گئے ہیں محراب و منبر

شرمائے گا اب تا حشر طوفاں
ٹوٹی ہوئی اک کشتی ڈبو کر

اُس کارواں میں لطفِ سفر کیا
جس کارواں میں رہزن نہ رہبر

اب میکدے کا عالم نہ پوچھو
اک شیشۂ دل اور لاکھ پتھر

ہاں زندگی! اک پیغامِ لغزش
جینا پڑے گا کب تک سنبھل کر

اب شمعِ حسرت لَو دے اٹھی ہے
اے صرصرِ غم! دامن بچا کر

آشفتگی کو نیند آ چلی ہے
برہم نہ ہو وہ زلفِ معنبر

کیا اب بھی کوئی فردا ہی باقی
کس سوچ میں ہوا ہے اہلِ محشر

اتنا تغافل اے چشمِ ساقی!
رہ رہ گئے ہم ساغر اُٹھا کر

کیا طنزِ دوراں کیا جورِ خوباں
دل ہی ستم کش دل ہی ستم گر

چپ ہیں روشؔ! اب اربابِ دانش
تھے طنز کیا کیا اہلِ جنوں پر

پاسِ وحشت ہے تو یادِ رُخِ لیلیٰ بھی نہ کر
عشق کو قیدیٔ زنجیرِ تمنّا بھی نہ کر

موجِ خود دار اگر ہے تو سوئے غیر نہ دیکھ
کسی طوفاں، کسی ساحل کا بھروسا بھی نہ کر

زینتِ دہر اک آرائشِ باطل ہی سہی
نگہِ شوق کو محرومِ تماشا بھی نہ کر

شرک ہے شرک یہ اے واعظِ آشفتہ خیال
غمِ عقبیٰ کو شریکِ غمِ دُنیا بھی نہ کر

کیف انگیز نہیں، بادۂ امروز، نہ ہو
دل کو حسرت کشِ پیمانۂ فردا بھی نہ کر

محرمِ رازِ محبّت ہے اگر دل تیرا
تو خدا کے لئے اس راز کو رسوا بھی نہ کر

حیرتِ شوق ہی بن جائے نہ غمّازِ روش
تو اس انداز سے ناداں اُسے دیکھا بھی نہ کر

(۱۹۲۸ء)

کہیں فسانۂ غم ہے کہیں خوشی کی پکار سنے گا آج یہاں کون زندگی کی پکار
خدا شناس ہے زاہد، مگر نہیں معلوم کہ آدمی کو جگاتی ہے آدمی کی پکار
لباسِ صبح میں ہے کوئی رہبرِ صادق جگا رہی ہے اندھیرے کو روشنی کی پکار
فغانِ روحِ محبت تھی یا صدائے حبیب سُنی تو ہے دلِ خاموش نے کسی کی پکار

ترا سکوت نہ رسوا کرے رَوش تجھ کو
کہ دور دور پہنچتی ہے خامشی کی پکار

(۱۹۵۱ء)

عمرِ ابد سے خضر کو بیزار دیکھ کر خوش ہوں فسونِ نرگسِ بیمار دیکھ کر
کیا خلد بھی ہے جلوۂ جاناں سے بے نصیب حیراں ہوں صورتِ در و دیوار دیکھ کر
شایانِ جرمِ عشق نہ تھی قیدِ زندگی جی شاد ہو گیا رسن و دار دیکھ کر
بادہ بہ قدرِ ظرف سہی، رسمِ میکدہ ساقی! نزاکتِ دلِ میخوار دیکھ کر
اب جستجوئے دوست کی منزل کہیں بھی ہو ہم چل پڑے ہیں راہ کو دشوار دیکھ کر
یہ شوخیٔ سکوت قیامت سے کم نہیں چپ ہیں کسی کو تشنۂ گفتار دیکھ کر
اب اس سے کیا غرض یہ حرم ہے کہ دیر ہے بیٹھے ہیں ہم تو سایۂ دیوار دیکھ کر
رازِ فروغِ آخرِ شب کچھ نہ کھل سکا کیوں خوش ہے شمع صبح کے آثار دیکھ کر

سازِ غزل اٹھا ہی لیا ہم نے اے رَوش
اِس چشمِ نیم باز کا اصرار دیکھ کر

(نومبر ۵۱ء)

جنّتِ دید بہ اندازِ دگر پیدا کر
حسن آباد ہو جس میں وہ نظر پیدا کر

کب سے پامال ہیں یہ ترک وطلب کی راہیں
عشق کی ایک نئی راہ گزر پیدا کر

منتظر ہیں ابھی تیرے لئے لاکھوں جلوے
تو ذرا وسعتِ دامانِ نظر پیدا کر

دلِ افسردہ محبت کو نہیں ہے درکار
اس گلستاں کے لئے اک گلِ تر پیدا کر

درِ جاناں پہ اگر حسرتِ سجدہ ہے تجھے
عرش جس کے لئے جھک جائے وہ سر پیدا کر

کیا ہوا گر تری راتیں رہیں بیگانۂ خواب
حسن بیدار ہو جس سے وہ سحر پیدا کر

فلکِ عشق کے ٹوٹے ہوئے تاروں کی قسم
اک نئی انجمنِ شمس و قمر پیدا کر

زندگی کے لئے ہے موت فریبِ آرام
حُسنِ منزل سے تقاضائے سفر پیدا کر

ہے رواں جن کے لئے قافلۂ نیم شبی
وہ ستارے بھی تو اے دیدۂ تر پیدا کر

عالمِ وعدۂ فردا جو یہی ہے تو روش
اور اک سلسلۂ شام و سحر پیدا کر

(سنہ ۱۹۴۱ء)

با خبر، حُسن کی راہوں سے گزر
خود فراموش نگاہوں سے گزر

تنگ ہے خاک نشینوں کے لئے
عرش و طوبیٰ کی پناہوں سے گزر

آدمیت کی بلندی لے کر
بادشاہوں کی نگاہوں سے گزر

در گزر، شیوۂ معبود سہی
تو ہی خود اپنے گناہوں سے گزر

تازگیٔ دلِ شبنم لے کر،
غم کی جھلسی ہوئی راہوں سے گزر

عشق خود رہبرِ صادق ہے تو روش
بے خطر عشق کی راہوں سے گزر

(اگست سنہ ۱۹۵۱ء)

کش مکشِ رنج و مسرت سے دور
رہیئے ہر اک محفل و خلوت سے دور

کل بھی رہیں گے یہ اسیرانِ زلف
دست درازیٔ قیامت سے دور

تمکنتِ چشمِ عنایت بجا
ہم ہی رہے چشمِ عنایت سے دور

حالِ غریبانِ محبت ہی کیا
جی تو رہے ہیں درِ دولت سے دور

ہائے ترا دامنِ لطف و کرم
ایک گنہگار محبت سے دور

گردشِ دوراں کی نوازش روش
شام ہوئی وادیٔ غربت سے دور

(ش)

اس تغافل سے چھلک جائے نہ پیمانۂ راز
پاسِ محفل بھی زرا اے نگہہِ بندہ نواز
نہ کوئی راہ طلب ہے نہ کوئی جادۂ ترک
جادہ پیما ہے کہاں قافلۂ اہلِ نیاز
اک برہمن نے بڑے درد سے یہ بات کہی
خود اسیرِ ہوس بُت شکنی ہے بُت ساز
اب وہ زلفیں بھی نہیں سلسلہ جنبانِ کرم
اور ہوں بھی تو کہاں فرصت شبہائے دراز
کششِ سادگیٔ حُسن و محبّت کو سمجھ
اے گرفتار تماشائے فسون و اعجاز
زندگی لرزہ براندام کہ شمشیر ہے عشق
خم، سرِ عشق کہ ہے جوش پہ طغیانیٔ ناز
سرنگوں ہیں پسِ دیوار حوادث اب تک
ہم کو معلوم ہے اربابِ خرد کی پرواز
عاشقی، زندگیٔ دل سے عبارت ہے رَوش
آتشِ دل ہو فسردہ تو حقیقت نہ مجاز

(جنوری سنہ ۵۳ء)

(س)

زندگی ہے محشرِ امید و یاس
کھو نہ جانا اے دلِ فردا شناس

رنج و راحت میں ہے اک ربطِ لطیف
سرخوشی ہے شاہدِ غم کا لباس

چاک داماں سے جنوں کو واسطہ
ہے یہ سب گل کاریٔ ہوش و حواس

کس پہ ہوتے ہیں محبّت کے ستم
شکرِ لامحدود، بے پایاں سپاس

ہے زبانِ عشق پر مہرِ سکوت
با ہزاراں التجا و التماس

تیرے دامن کے لئے اے زندگی
کیا رہا ہے ہم سے دیوانوں کے پاس

کھل نہ جائے عشق کی افسردگی
کیوں بہارِ آفرینش ہے اداس

اشکِ غم خود کاشفِ اسرار ہیں
تو کہاں بھولا ہے اے انجم شناس

عشق، رازِ حسنِ پنہاں ہے روش
کر نہ لینا اہلِ ظاہر پر قیاس

(سنہ ۴۵ء)

کس نے بھیجا تھا پیامِ ہوش، دیوانوں کے پاس
دامنوں کے چاک آ پہنچے گریبانوں کے پاس

رند پیمانہ شکن ہیں، محتسب مینا بدوش
دولتِ جام و سبو ہے آج فرزانوں کے پاس

اجنبی کرتے ہیں تیرا ذکر کس اخلاص سے
دیکھتا ہوں آج تیرا درد بیگانوں کے پاس

زندگی کی ہر مسرت، زندگی کو سونپ دی
رہ گیا ہے اک غمِ بے نام دیوانوں کے پاس

کوئی کیا جانے کہ کیا گزرا ہے دل پر سانحہ
برہمن کیوں سر جھکا لیتا ہے بُت خانوں کے پاس

گر نہ ہوتیں، قیدِ رسم وراہ کی مجبوریاں
شمع خود اُڑ کر پہنچتی اپنے پروانوں کے پاس

میکدے میں بھی وہی ہے دل کی ویرانی روش!
شیشہ خالی بھی ہے، لبریز پیمانوں کے پاس

(سنہ ۴۶ء)

(۵)

کہاں تک جستجو، اے حُسنِ رُوپوش
نگاہیں ہو چلی ہیں خود فراموش

در و دیوار کا کب تک سہارا
سنبھلنا اے حیاتِ خانہ بردوش

نقابِ رُخ سرکتا جا رہا ہے
مگر وہ خود ہوئے جاتے ہیں روپوش

بہ قیدِ ظرف کب تک بادۂ غم
خداوندا بہ قدرِ ذوقِ مے نوش

حریمِ غم ہو یا ایوانِ عشرت
چراغِ صبح کو ہونا ہے خاموش

شکستِ نغمۂ دل کو زمانہ
بہت سمجھا تو سمجھا جنّتِ گوش

مزا پینے کا آیا تلخیوں سے — بہت ممنون ساقی ہیں بلانوش
خراب جستجو ہیں جام و مینا — کہاں پہنچا کوئی بیگانۂ ہوش
کسے اب فرصتِ تعبیر ہستی — مری آنکھیں ترا خواب فراموش

روش! کیا شکوۂ جادو نگا ہاں
یہ دل کچھ کم نہیں غارت گر ہوش

(جون سنہ ۴۵ء)

(ص)

غیر فانی ہے زندگی کا خلوص — حسنِ یزداں ہے آدمی کا خلوص
خضر منزل سے کم نہیں ای دوست — ایک ہمدرد اجنبی کا خلوص
رنج و راحت کا حسن ہیں ای دوست — غم کی پاکیزگی خوشی کا خلوص
جیسے کلیوں کا عالمِ محجوب — ہے کچھ ایسا ہی دوستی کا خلوص
وہ زمانے کے شکوہ ہائے غلط — وہ محبت کی خامشی کا خلوص
رہ نماؤں کے طنزِ بے جا پر — ہائے وہ اپنی گم رہی کا خلوص
یہ پرستارِ مصلحت دنیا — یاد رکھے گی کیا کسی کا خلوص
موجِ خوشبوئے التفات آمیز — اس تغافل کی سادگی کا خلوص
چشم ساقی ہے ساغرِ لبریز — رنگ لایا ہے تشنگی کا خلوص
رنگ بخشِ شگفتِ لالہ و گل — اس کے اندازِ برہمی کا خلوص
ہے نگہبان سوزِ پروانہ — شمع ہستی کی دوستی کا خلوص
پھر غنیمت ہی میکدے میں روش — کم سہی کم رند مشربی کا خلوص

(جولائی سنہ ۵۲ء)

(ض)

مقصد سفر سے ہے، کسی منزل سے کیا غرض
اے موجِ زندگی! تجھے ساحل سے کیا غرض

ہے غیر کون کس کا گلہ کر رہا ہے تو
اے حق پرست، شکوۂ باطل سے کیا غرض

کہنے کی بات بھی ہو تو دنیا سے کیا کہیں
دنیا کو داستانِ غمِ دل سے کیا غرض

سوزِ غمِ نہاں کو جو سمجھے ہیں بوئے گُل
اُن کو فغانِ دردِ عنادل سے کیا غرض

مفہومِ کائنات ہے اک گوشۂ خیال
خلوت کا ذکر کیا کسی محفل سے کیا غرض

ہم حلقہ بستِ زلفِ نگاراں ہیں اے ندیم
ہم کو کشودِ عقدۂ مشکل سے کیا غرض

ہم خاکِ پائے رہبرِ کامل ہیں اے روشؔ
ہم کو غبارِ جادہ و منزل سے کیا غرض

(اپریل ۱۹۵۳ء)

(ط)

نہ بے رُخی نہ ستم ہائے گاہ گاہ غلط
مگر حکایتِ حالِ دلِ تباہ غلط

رہا ہے دامنِ اہلِ جنوں میں کیا باقی
اُلجھ رہے ہیں فقیہانِ دیں پناہ غلط

فلک سے دادِ سخن ہائے راست کیا ملتی،
ملالِ خاک نشینانِ کج کلاہ غلط

یہی تو مصلحتِ عقل ہے کہ ایک ہی بات
ہو گاہ گاہ بجا اور گاہ گاہ غلط

حریفِ آتشِ گُل کیا ہو خرقۂ زاہد
خزاں نے ڈھونڈ لیا گوشۂ پناہ غلط

بہ یک خیال، جہاں سو حجاب اُٹھتے ہیں
وہاں شکایتِ حیرانیٔ نگاہ غلط

صنم کدے میں وہی حرفِ شوق کام آیا
سمجھ رہے تھے جسے اہلِ خانقاہ غلط

روش کو وضع جہاں تے بنا دیا خود دار!
روش سے شکوۂ یارانِ رسم و راہ غلط

(سنہ ۴۵ء)

(ع)

ہزار قطرۂ شبنم ہو خاک پائے شعاع
نگاہ ناز غنی ، دل بہت حقیر متاع

فروغِ دہر ہے یہ بت گری و بت شکنی
کمالِ ہوش ہے بُت خانہ و حرم کی نزاع

بہت قریب ہیں آثارِ جلوہ گاہِ حبیب
نگاہِ شوق! بس اب آگیا مقام وداع

یہ خود فریبیٔ عشرت ، وہ خود شناسیٔ غم
یہ رقص اہلِ نظر ہے ، وہ وجد اہلِ سماع

زبوں وہی ہے جو سرکش ہو ناتوانوں سے
یہاں جو سر کو جھکادے وہی کریم و شجاع

بہ صد حجاب گریزاں نگاہِ یار روش!
خیالِ یار نگہباں بہ صد ہزار انواع

(اکتوبر ۱۹۴۶ء)

(غ)

عشق نے بخشا دو عالم سے فراغ
صبح ہوتے بجھ گئے سارے چراغ

خونِ دل ہی قسمتِ مژگاں سہی
اور چھلکیں تیری آنکھوں کے ایاغ

اے ہوائے دہر، آہستہ خرام
بجھ نہ جائے خلوتِ غم کا چراغ

اُن کی دزدیدہ نگاہوں سے ملا،
میری گم گشتہ اُمیدوں کا سراغ

عازمِ دشتِ جنوں ہے زندگی
رہ گئے ہوش و خرد کے سبز باغ

گوشۂ دل سے نکل کر آرزو
بن گئی ہے دامنِ ہستی پہ داغ

کِس کے دامن کی نوازش ہے روش!
عرش پر ہے آج اشکوں کا دماغ

(مارچ سنہ ۱۹۴۴ء)

(ف)

چشمِ تر، اُٹھ نہ سکی خاکِ نشیمن کی طرف
ہم نے منہ پھیر لیا دیکھ کے گلشن کی طرف

ڈوب جائے کہ سلامت رہے کشتی تیری
نہ بڑھا ہاتھ کبھی خضر کے دامن کی طرف

کون بے مائگیٔ عشق کا پُرساں ہوتا
دل کھنچا جاتا ہے معصومیٔ رہزن کی طرف

وقتِ گلگشت، کہیں لالہ و گُل چوم نہ لیں
دیکھتے جاتے ہیں سمٹے ہوئے دامن کی طرف

حُسنِ تخلیق سزاوارِ تماشا ہے رَوِشؔ
بُت شکن بن کے نہ چل جلوہ گہِ فن کی طرف

(فروری سنہ ۱۹۴۸ء)

دیکھ کر ساغر و سبو کی طرف
اک نظر، خونِ آرزو کی طرف

نہ سمجھ کھیل دل کی ویرانی
رُخ نہ کر خُلد رنگ و بُو کی طرف

دین و دل گر گئے نگاہوں سے
دیکھ کر حسنِ خوب رو کی طرف

تکتی جاتی ہے کیوں عروسِ بہار
دلِ صد چاک و بے رفو کی طرف

جستجو کر مگر نہ دیکھ رَوِشؔ
کبھی انجامِ جستجو کی طرف

(مئی ۵۳ء)

(ق)

تنگ زندانِ تمنا میں ہے جانِ مشتاق
اے جنوں توڑ بھی دے حلقۂ زنجیرِ فراق

ہائے یہ دربدری اشکِ محبت کے لئے
میری پلکوں پہ گراں ہے ترے دامن پہ بھی شاق

زندگی! صبحِ قیامت سے بھی کیا ہو امید
کس نے دیکھا ہے مآلِ غمِ شبہائے فراق

کارگر عقل و خرد کا کوئی افسوں نہ ہوا
نگہِ عشق نے توڑا ہے طلسمِ آفاق

شوقِ بے حد نے کیا دیدۂ و دل کو غارت
اور پھر بھی نہ کھلا کون ہے کتنا مشتاق

سرد آہوں سے چلا کام نہ اشکوں سے روشؔ
تیز ہوتی ہی گئی آتشِ غمہائے فراق

(فروری ۴۳ء)

فنا، فسونِ محبت، بقا فسانۂ عشق
تمام عالمِ امکاں ہے اک بہانۂ عشق

یونہی پھریں گے بھٹکتے یہ مہر و ماہ و نجوم
پسِ حجاب ہے جب تک چراغِ خانۂ عشق

یہاں تصورِ اہلِ نظر بھی ہے ناکام
بلند حدِ نظر سے آستانۂ عشق

رہیں گے دیدۂ و دل درفشان و لعل افشاں
نہ کم ہوا ہے نہ ہوگا کبھی خزانۂ عشق

کبھی ادھر بھی ہو اے برقِ ناز! چشمِ کرم
روشؔ نے دل کو بنایا ہے آشیانۂ عشق

(جنوری سنہ ۱۹۴۲ء)

کـ

اتنا بھی نہ ہونا تھا اے بادِ صبا بے باک
پھولوں کی قبائیں چاک، کلیوں کے گریباں چاک

اک بربطِ بے نغمہ، اک ساغرِ بے بادہ
جو دل نہیں شکستہ، جو آنکھ نہیں نمناک

خاکِ رہِ الفت ہے اک سرمۂ بینائش
اس خاک سے کرتے ہیں انجم بھی نگاہیں پاک

بربادِ محبّت نے کھائی تھی جہاں ٹھوکر
وہ نقشِ قدم اب تک ہے سجدہ گہِ افلاک

اس عالمِ امکاں میں جو کچھ ہے محبّت ہے
کونین کی قیمت کیا انبارِ خس و خاشاک

دیکھو تو روش بڑھ کر، کیا حضرتِ واعظ ہیں
یہ کون سبو لے کر بیٹھا ہے بذیرِ تاک

(اپریل سنہ ۱۹۳۵ء)

ہے پا بوسِ جنوں خود احتساب باغباں اب تک
لپٹ جاتی ہے دامن سے ہوائے گلستاں اب تک

تقاضا کر رہا ہے حسنِ منزل تیز گامی کا
مجھے روکے ہوئے ہے انتظارِ کارواں اب تک

وہ انساں، انقلابِ آسماں کی راہ تکتا ہے
کہ جس کا منتظر ہے انقلابِ آسماں اب تک

مرے نقشِ قدم سے آج وہ راہیں فروزاں ہیں
کہ جن کو چھو نہیں سکتی تھی چشمِ کہکشاں اب تک

تجھے ضد آج بھی ہے میرے پیمانِ محبت سے
مجھے تیرے تغافل پر محبت کا گماں اب تک

نہ سمجھے ہیں وہ میرے دردِ دل کو اور نہ سمجھیں گے
روشؔ! نا آشنا ہیں مجھ سے میرے ہمزباں اب تک

(مارچ سنہ ۴۴ء)

گ

برتر از انتخاب ہیں ہم لوگ — آپ اپنا جواب ہیں ہم لوگ

ہوش کھو کر بھی، یہ نہ بھول سکے — کس جگہ باریاب ہیں ہم لوگ

دامنِ شب بھگو کے اشکوں سے — صبح دم، آفتاب ہیں ہم لوگ

ہم سے ہے حُسنِ خلوت و محفل — وہ حجاب الحجاب ہیں ہم لوگ

ہر قدم پر ہے اک جہانِ دِگر — آیتِ انقلاب ہیں ہم لوگ

جس سے زندہ ہے کائنات کا دل — اُس صدا کا جواب ہیں ہم لوگ

چارہ گر آج تک سمجھ نہ سکے — کیوں تباہ و خراب ہیں ہم لوگ

حُسن سے شکوۂ حجاب بھی ہے — اور خود ہی حجاب ہیں ہم لوگ

لاکھ ناکامیاں ہیں دامن میں — اور پھر کامیاب ہیں ہم لوگ

واعظ شہر نے درست کہا — قابلِ اجتناب ہیں ہم لوگ

دیکھ لیں ہم کو، دیکھنا ہو جنھیں، — اس کی آنکھوں کا خواب ہیں ہم لوگ

عشق اک خواب جاوداں ہے روش

اور تعبیر خواب ہیں ہم لوگ

(سنہ ۳۴ء)

فروغِ گل سے الگ، برقِ آشیاں سے الگ
لگی ہے آگ یہاں سے الگ وہاں سے الگ

سکوتِ ناز نے اظہار کر دیا جس کا
وہ ایک بات تھی پیرایۂ بیاں سے الگ

سنیں تو ہم بھی ذرا جبر و اختیار کی بات
کہاں کہاں ہیں یہ شامل، کہاں کہاں سے الگ

ہمارا حال زمانے سے کچھ جُدا تو نہیں
یہ داستاں نہیں دنیا کی داستاں سے الگ

ہزار گم رہئی اہلِ کارواں تسلیم
مگر نہ خضر کو ہونا تھا کارواں سے الگ

خزاں کا ذکر ہی کیا ہے کہ اے رَوش! ہم نے
بھری بہار گزاری ہے گلستاں سے الگ

(جنوری ۵۳ء)

مدہوش ہیں ہم لوگ نہ ہشیار ہیں ہم لوگ
حیرت زدۂ جلوہ گہِ یار ہیں ہم لوگ

ہنس بول لیا کوئی تو ہیں بندۂ بے دام
آزاد ہیں ہم لوگ، گرفتار ہیں ہم لوگ

تیرا ہی تغافل ہو کہ بیدادِ زمانہ
صد شکر کہ اے دوست سزاوار ہیں ہم لوگ

ہے جبیں یہ جبینِ وقت کہ ہم کوہ گراں ہیں
سمجھا تھا کہ گرتی ہوئی دیوار ہیں ہم لوگ

اب تک وہی سودا ہے ہمیں جنسِ وفا کا
بازار میں اپنے ہی خریدار ہیں ہم لوگ

کیوں شکوۂ آلامِ زمانہ نہیں کرتے
احباب گریزاں ہیں کہ خوددار ہیں ہم لوگ

اس انجمنِ ناز میں کیا کام ہمارا
تہمت زدۂ شوخیٔ گفتار ہیں ہم لوگ

اب شیخ و برہمن سے روشؔ دل نہیں ملتا
کیا کیجیئے، کافر ہیں نہ دیں دار ہیں ہم لوگ

(۱۹۵۴ء)

بہت درد ہم سے جتاتے ہیں لوگ
اُسے دیکھ کر بھول جاتے ہیں لوگ

ہمیں جس نے رسوائے عالم کیا
وہی بات ہم سے چھپاتے ہیں لوگ

نہ بوئے مروّت نہ رنگِ وفا
یونہی بے سبب گُل کھلاتے ہیں لوگ

کیا ہم نے کب شکوۂ بے رُخی
یہ کیوں ہم سے آنکھیں چُراتے ہیں لوگ

بہت یوں تو رسمِ وفا عام ہے
مگر کیا کریں بھول جاتے ہیں لوگ

وہاں تک کسی کی رسائی نہیں
ہمیں سے یہ باتیں بناتے ہیں لوگ

کچھ اے شعلۂ عشق ان کا علاج
بہت ہم سے دامن بچاتے ہیں لوگ

روشؔ اک قدم، جانبِ میکدہ
اُدھر بھی تو آتے ہیں جاتے ہیں ہم لوگ

(مئی ۶۵۳)

(دل)

کہیں نشانِ محبّت، نہ سایۂ غمِ دل
یہی تھی قافلۂ انقلاب کی منزل

یہ نازِ کم سخنی و یہ صد کم آمیزی
کوئی ہوا تو سہی آج زینتِ محفل

یہ رہبری بھی عجب ہے کہ رہ نماؤں نے
بدل دئے ہیں نشاناتِ جادہ و منزل

ہے اب غرورِ چمن پر یہ تذکرہ بھی گراں
کہ اس بہار میں ہے کس کا خونِ دل شامل

کسے ڈبو کے ندامت میں غرق ہے طوفاں
یہ کس غیور نے دیکھا نہ جانبِ ساحل

نظر کے سامنے دم توڑتے رہیں انساں
یہ زندگی ہو تو اس زندگی سے کیا حاصل

یہی وہ صبحِ نجاتِ وطن ہے جس نے تجھے
کیا ہے شامِ غریبانِ ہند سے غافل

ہے تجھ کو دوریٔ منزل سے اب شکایت کیوں
تری تلاش میں پہنچی کہاں کہاں منزل

ہیں اس سکوت کے پردے میں اور کچھ طوفاں
سمجھ رہا ہوں روش! ہر اشارۂ ساحل

(دسمبر ۴۷ء)

کب سے سرگرم سفر ہے یہ جہانِ مہ و سال
اس گزر گاہِ رواں میں ترا ملنا ہے محال
نگہہِ ناز میں تھا آج اک ایسا بھی سکوت
زندگی بھول گئی شوخئی اندازِ سوال
کس کو معلوم ترے وعدۂ فردا کے سوا
عشق شایانِ جدائی ہے نہ شایانِ وصال
خلوتِ زلفِ پریشاں مرے خوابوں کا وطن
بوسۂ گوشۂ داماں، مری پروازِ خیال
یوں تو ہر خوابِ تمنّا ہے، محبت افروز
فکرِ تعبیرِ تمنّا ہے محبّت کا زوال
زندگی، دشتِ حوادث میں رہی، گرم سفر
ہم سجاتے ہی رہے انجمنِ خواب و خیال
رُوحِ غم، سایۂ عشرت میں، سجود آمادہ
ہائے انساں تری تہذیب کی معراجِ کمال
ایک نادیدہ مسرّت کی امانت ہیں رَوِش!
میرے آنسو نہیں آلودۂ اندوہ و ملال

(سنہ ۴۵ء)

حرم ہو بُت کدہ ہو، دَیر ہو کچھ ہو، کہیں لے چل
جہاں وہ حسنِ لامحدود ہو، اے دل وہیں لے چل
دل اب تک دیکھتا ہے خواب تاثیرِ محبّت کے
جہاں سے لائی تھی اے نامرادی پھر وہیں لے چل
ابھی کچھ اور بھی رسوائیاں ہیں منتظر میری
اُسی محفل میں مجھ کو اے دلِ خلوت نشیں لے چل
یہ پروانے بہت کچھ جل چکے موہوم شعلوں پر
انھیں اے زندگی اب جانبِ شمعِ یقیں لے چل
روشؔ یہ جان بیتاب و حزیں، جس کا عطیہ ہے
اُسی کے روبرو یہ جان بے تاب و حزیں لے چل

(۴)

توڑ کر اُٹھّے ہیں جام و شیشہ و پیمانہ ہم
کس سے کہہ دیں آج رازِ نرگسِ مستانہ ہم
بجلیاں روپوش، طوفاں دم بخود، ششدر حیات
جا رہے ہیں کس طرف اے لغزشِ مستانہ! ہم
اور جو کچھ ہے وہ سب زیبائشِ افسانہ ہے
تو ہے افسانہ ہمارا اور ترا افسانہ ہم

سر جھکا لیتے ہیں سوئے خلوتِ دل دیکھ کر
جب کہیں سنتے ہیں ذکرِ کعبہ و بُت خانہ ہم

زندگی اک مستقل شرحِ تمنّا تھی، مگر
عمر بھر رازِ تمنّا سے رہے بیگانہ ہم

دور پہنچے میکدے کی سرحدوں سے تشنہ کام
تجھ کو لے جائیں کہاں اے گردشِ پیمانہ ہم

عشق خود ہے حُسن کے رُخ پر نقابِ سرمدی
ہیں بہ ہر صورت حجابِ جلوۂ جانانہ ہم

کون ہوگا اس بھری محفل میں ہم سا اجنبی
تجھ سے بھی ناآشنا ہیں خود سے بھی بیگانہ ہم

خشک آنکھیں، روح تنہا، دل شکستہ، لب خموش
بستیوں میں دیکھتے ہیں صورتِ ویرانہ ہم

ہم تک اب آئے نہ آئے دَورِ پیمانہ رَوش!
مطمئن بیٹھے ہیں زیرِ سایۂ میخانہ ہم

(سنہ ۵۲ء)

آنکھ تیری سوئے کعبہ، دل ترا بیت الصنم
مجھ کو تیرے دل کا اندیشہ، تجھے، فکرِ حرم

واعظِ ناداں گرائے جا، حجابوں پر حجاب
کوئی دیوانہ اُٹھا دے گا نقابِ کیف و کم

اُس نے منشائے الٰہی کو مکمّل کر دیا
اپنی آنکھوں پر لئے جس نے محبت کے قدم

ہم نشیں لالہ و گل ہو تو کھل جائے یہ راز
بوئے گل کہتے ہیں جس کو ہے نمودِ سوزِ غم

عشق نے توڑا دلِ شیخ و برہمن کا غرور
عشق ہے غارت گرِ کاشانۂ دیر و حرم

جرعۂ شبنم ہو یا میخانۂ بحرِ رواں
یہ بھی ساقی کا کرم ہے وہ بھی ساقی کا کرم

حسن پر ہم مہرباں ہو کر بھی ہے نامہرباں
سرگرانی کا بہانہ بن گیا ترکِ ستم

عشق کا اک لمحۂ بیدار ہے عُمرِ ابد
عشق کا اک فرش پا انداز ہے خوابِ عدم

لحکلاہی تیرے مستوں کی رہے گی پیش پیش
تختۂ دار و رسن ہو یا خیابانِ ارم

دیکھئے کب ختم ہوں آرائش تاویلاتِ فرقت
روز اک پیغام تو لاتی ہے بادِ صبح دم

(۱۹۴۵ء)

شبِ فراق میں تسکین خواب تیرا نام — مری سحر کے لئے آفتاب تیرا نام
تری کشش سے مرا ہر نفس ہے وابستہ — مرا سکون، مرا اضطراب تیرا نام
ہزار بار جو حائل ہوا محبّت میں — اُٹھا گیا وہ حجاب الحجاب تیرا نام
حرام، تذکرہٗ ماسوا محبّت میں — ہر اک سوالِ وفا کا جواب تیرا نام
ملی طلسم خیالات سے نجات مجھے — دکھا گیا ہے اک ایسا بھی خواب تیرا نام
وہ داغِ غم جسے سمجھا تھا جاوداں میں نے — بنا گیا اُسے نقشِ بر آب تیرا نام

دلِ روش کے لئے زندگی ہے یاد تری
مرادِ زندگیٔ کامیاب تیرا نام

(۳۹ء)

(ن)

دوائے درد، دُعا کے سوا کچھ اور نہیں
دعا، کمال رضا کے سوا کچھ اور نہیں
وہ کوئی نالۂ غم ہو کہ نغمۂ عشرت
شکستِ دل کی صدا کے سوا کچھ اور نہیں
بجا ہے گر مری تعزیر ہو تغافلِ ناز
مرا قصور وفا کے سوا کچھ اور نہیں

بہ روزِ تہنیتِ خیر مقدمِ محبوب،
فسونِ بادِ صبا کے سوا کچھ اور نہیں
طریقِ عشق میں کہتے ہیں جس کی گم شدگی
تلاشِ راہ نما کے سوا کچھ اور نہیں
ستم نصیبِ تغافل کو ہر عتاب ترا
پیامِ لطف و عطا کے سوا کچھ اور نہیں
روشؔ، یہ عالمِ فرقت یہ کائناتِ وصال
خیالِ خوابِ تمنا کے سوا کچھ اور نہیں

(۱۹۳۴ء)

کیا مری بربادیاں، رسوائے دوراں ہو گئیں
کس سے پوچھوں، کیوں تری زلفیں پریشاں ہو گئیں
حشر میں اک اشکِ لرزیدہ نے سب کچھ کہہ دیا
مختصر صدہا، حکایاتِ پریشاں ہو گئیں
عشق نے ٹھکرا دیا جن کو وہ سب دشواریاں
وقت کی نیرنگیوں کے ساتھ آساں ہو گئیں
خُلد آزادی یہی دنیا تھی انساں کے لئے
مصلحت اندیشیاں، دیوارِ زنداں ہو گئیں
روح کو مہکا دیا، کچھ حسرتوں کی یاد نے
چند مرجھائی ہوئی کلیاں گلستاں ہو گئیں

منتظر، کچھ خستہ و درماندہ ویرانے بھی تھے
سب بہاریں کیوں سزاوارِ گلستاں ہو گئیں
ہائے اب ان بستیوں کا ذکر ہی کیا ہم نشیں
جو ابھی بسنے نہ پائی تھیں کہ ویراں ہو گئیں
حُسن کی معصومیاں کچھ تیری زلفوں میں چھپیں
اور کچھ رسوا بنامِ کفر و ایماں ہو گئیں

دل کی بربادی کا شکوہ کیا مجھے ہوتا ہے روش
سوچتا ہوں وہ نگاہیں کیوں پشیماں ہو گئیں

(سنہ ۳۸ء)

خضرِ اقلیمِ ابد، اے فلک پیر ہوں میں
زندگی خواب ہے اور خواب کی تعبیر ہوں میں
عیشِ امروز ہے پیغام پہ آزادی،
غمِ فردا کا اشارا ہے کہ زنجیر ہوں میں
یہ محبت کی لطافت ہے تو شاید اک دن
میری تصویر ہو تو اور تری تصویر ہوں میں
ہے گماں کس کو کہ منّت کشِ اسباب ہے عشق
کون کہتا ہے کہ شرمندۂ تدبیر ہوں میں
یوں تو دل تیری محبت میں رہا ہے معصوم
یہ بھی ہے جُرم تو ہاں قابلِ تعزیر ہوں میں

تجھ سے نسبت ہو تو تقدیر ہے پابند مری
دور ہوں تجھ سے تو وابستۂ تقدیر ہوں میں
چشمِ کشمیر ہے جس کے لئے بے خواب رَوش
محفلِ اہلِ نظر میں وہ جہاں گیر ہوں میں

(سنہ ۲۶ء)

راہ میں روک نہ لے، گوشۂ آرام کہیں
میں مسافر ہوں، مری صبح کہیں، شام کہیں
نامناسب تو نہیں ہے، غمِ دنیا سے گریز
ہاں غمِ عشق پہ آ جائے نہ الزام کہیں
اے صبا! فرصتِ مستانہ خرامی کب تک
کھو نہ دے تجھ کو یہ سرمستیٔ پیغام کہیں
ہائے وہ خوابِ پریشانِ محبّت، اے دوست
چونک اُٹھتا ہوں جو سنتا ہوں ترا نام کہیں
اُن سے کہنا کہ ہوی وادیٔ غم بھی ویراں
تجھ کو مل جائیں جو وہ اے شفقِ شام کہیں
دیکھ کر زلفِ پریشاں کو نگہبانِ حیات
چھپ گئی ظلمتِ اندیشۂ انجام کہیں
درِ میخانہ رَوش! میرے لئے کیا کُھلتا
راستہ بھول گئی گردشِ ایام کہیں

(سنہ ۴۹ء)

محبت کی جہاں بانی کے دن ہیں
زمیں پر خلد سامانی کے دن ہیں

یہ ہے دورِ جلالِ ابنِ آدم
نہ سلطانی نہ خاقانی کے دن ہیں

جو ہیں اپنی جگہ خورشید بنیاد
اب اُن ذرّوں کی تابانی کے دن ہیں

ارادوں کی بلندی اوج پر ہے
حوادث کی پشیمانی کے دن ہیں

محبّت جلوہ گر ہے جھونپڑوں میں
اب اس دولت کی ارزانی کے دن ہیں

ہر اک زنجیر ہے اب پاشکستہ
ہر اک زنداں کی ویرانی کے دن ہیں

زوال آمادہ ہے تعمیرِ اوہام
کمال فکر انسانی کے دن ہیں

قصیدے بادشاہوں کے ہوئے ختم
محبت کی غزل خوانی کے دن ہیں

تقدس ہو فرشتوں کو مبارک
رَوش! اب خُلقِ انسانی کے دن ہیں

(سنہ ۴۹ء)

جوانی ہے غزل خوانی کے دن ہیں
تمناؤں کی نادانی کے دن ہیں

نگاہوں میں جھجک ہے دل میں دھڑکن
محبت کی نگہبانی کے دن ہیں

بہت معصوم ہے ایک ایک لغزش
غرور پاک دامانی کے دن ہیں

ہزاروں میکدے ہوں جس میں شامل
کچھ ایسی تشنہ سامانی کے دن ہیں

مہ و خورشید و انجم ہیں قدم بوس
فروغِ حسنِ انسانی کے دن ہیں

نسیم شوق ہے اور نکہتِ ناز
عجب رنگیں پریشانی کے دن ہیں

حریفِ جلوۂ پیہم کہاں دل
اس آئینے کی حیرانی کے دن ہیں

یہ حسنِ بُت شکن اللہ اکبر — صنم خانوں کی ویرانی کے دن ہیں
رؔوش! یہ دولتِ سرمد مبارک
غمِ دل کی فراوانی کے دن ہیں

(۴۵ سنہ ء)

کسی کو معلوم، کہاں ہے نگہِ اہلِ یقیں
نہ سرِ عرشِ بریں ہے نہ تہِ فرشِ زمیں
ہے ہر اک شعلۂ نو پیرہن سوزِ کہن،
ہر تغیر ہے قدامت کے لئے نورِ جبیں
بات اتنی سی ہے اے محوِ حجاباتِ نظر
حُسنِ افکار میسّر ہو، تو دنیا ہے حسیں
جانِ بے تاب کو تسکین یہاں ہے نہ وہاں
خوابِ ہستی تری تعبیر نہ دنیا ہے نہ دیں
لڑکھڑاتے ہیں جو آرام گہِ منزل میں
کبھی خم تھی انھیں قدموں پہ حوادث کی جبیں
ہم پہ جو کچھ نہ گزر جائے وہ کم ہے اے دوست
خود فراموش ہے دنیا نہ محبّت خود بیں
تلخیٔ غم بھی نہیں زہرِ حوادث کا علاج
آج بھی ہوش میں ہے رندِ خرابات نشیں

ہاں مرا حال بُرا ہے یہ بجا ہے لیکن،
زلفِ گیتی مری حالت سے پریشاں تو نہیں
گل افسردہ ہو یا غنچۂ شاداں ہو روش!
نکہتِ زیست کسی رنگ میں محدود نہیں

(سنہ ۴۶ء)

ہیں گزرگاہ شب و روز فلک ہو کہ زمیں
دور تک منزلِ مقصود کے آثار نہیں
پوچھتے ہیں وہ مرا حال، بظاہر جن کو
کششِ دل کا گماں ہے نہ محبّت کا یقیں
یہ تصوّر کا دھندلکا سا بہت کافی ہے
ڈھونڈ لے گا مجھے خود ہی کوئی خورشید جبیں
تو مرے غم سے ہے کیوں سر بہ گریباں ای دوست
تیرے قدموں کی قسم! میں تو نہیں ہوں غمگیں
واعظ شہر ہے یہ نکتۂ نازک ہے نہاں
دل میں ہو آگ محبّت کی تو روشن ہو جبیں
ہے یہ اِس دَور کی آوارہ نگاہی کا مآل
دل و دیں اور کہیں، حُسنِ بتاں اور کہیں
کیا غرض ہے ہمیں درویشی و سلطانی سے
ہوسِ نانِ جویں ہے نہ غمِ تاج و نگیں

کھول آنکھیں تو زرا، جاگ تو اے رفتۂ خواب
خود قیامت سرِ بالیں ہے پشیمان و حزیں
ٹوٹ ہی جائے گا آخر یہ طلسمِ شب و روز
مل ہی جائے گا وہ جانِ مہ و خورشید کہیں

کیا کریں شکوۂ بے مہریٔ احباب، روشؔ!
ہم گنہگار ہیں، احباب کی تقصیر نہیں

(۱۹۴۶ء)

اب بتوں سے بھی گریزاں ہے دلِ دَیر نشیں
کوئی غارت گرِ دنیا ہے نہ غارت گرِ دیں
آسماں خود ہے تغافل زدۂ شیوۂ دوست
اپنی فریاد کو رسوا نہ کریں اہلِ زمیں،
میں نہ گلچیں ہوں نہ دریوزہ گرِ گلشن ہوں
میرا دامن ہے مرے دل کے لہو سے رنگیں
غمِ الفت میں ہے اک راحتِ پنہاں شامل
عشق اُتنا ہی مسرور کہ جتنا ہے حزیں
مجھ کو اے دانشِ حاضر تری قیمت معلوم
تو سزا وارِ گماں ہے نہ سزا وارِ یقیں
لکھ گیا ہے درِ میخانہ پہ کوئی آزاد
زندگی لغزشِ مستانہ ہے زنجیر نہیں

مجھ سے پوشیدہ نہیں پردۂ تقدیر کا راز
جو ترے دل میں نہیں، وہ تری قسمت میں نہیں
موت کو عشق میں کہتے تو ہیں پیغامِ وصال
زندگی! اُن کے تغافل سے یہ امید نہیں
اک تجلّی ہے جو کھینچے لیے جاتی ہے مجھے
کوئی جادہ بھی نہیں ہے کوئی منزل بھی نہیں
ایک دیوانہ یہ کہتے ہوئے ہنستا تھا روشؔ!
دلِ انساں بھی نہیں دردِ محبت کا امیں

(سنہ ۴۶ء)

خزاں میں حسنِ بہاراں نہیں تو کچھ بھی نہیں
تری نگاہ گل افشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
نہاں ہیں دل میں ترے لاکھ آفتاب تو کیا
ستارۂ سرِ مژگاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
بہت بلند ہے دل کا مقامِ خودداری
مگر شکست کا امکاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
گزر چکی تری کشتی ہزار طوفاں سے
ہنوز، حسرتِ طوفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
بہارِ گلکدۂ ناز، جاں فزا ہے، مگر
نسیمِ شوقِ خراماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

عزیز صبحِ وطن ہے، مگر یہ صبحِ وطن
شریکِ شامِ غریباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
سکوتِ عشق ہو یا اضطرابِ شوق روش
حجابِ راز میں پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(۳۸ سنہ ۶)

نگاہِ ناز گریزاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
مگر فروغِ دل و جاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
عجیب شے ہے محبت، مگر یہ آتشِ پاک
حریفِ پاکیٔ داماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
سکونِ دل تو کہاں ہے مگر یہ خوابِ سکوں
نثارِ زلفِ پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
فراغِ دل، سر و ساماں میں ڈھونڈنے والے
فراغِ بے سر و ساماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
بغیر عشق، خراباتِ زندگی تاریک،
اگر یہ شمع فروزاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہجومِ لطف و نوازش میں بے نیازیٔ دوست
ہزار طرح نمایاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہے خلوتِ دلِ ویراں ہی جلوہ گاہِ جمال
یہ خلوتِ دلِ ویراں نہیں تو کچھ بھی نہیں

جمالِ یار حجاب آشنا سہی، لیکن،
نقاب دیدۂ حیراں نہیں تو کچھ بھی نہیں
نگاہ دارِ دل ودیں سہی روش لیکن
خرابِ کفر نگاہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(سنہ ۳۸ء)

مستیٔ عشق بے حضور نہیں
بیخودی، آگہی سے دور نہیں
اس کے اندازِ خودنمائی میں
حُسن ہی حُسن ہے غرور نہیں
کیفِ غم، زینتِ حیات سہی
مگر اظہارِ غم ضرور نہیں
آخرش، نشۂ سکوں کب تک
زندگی درد ہے سرور نہیں
خود نظر ہے حجابِ نظّارہ
اعتبارات کا قصور نہیں
اور ہی کچھ ہے رازِ بے تابی
عشق اتنا تو ناصبور نہیں
یہ کسی کا حجابِ روز افزوں
کیا مرے عشق کا ظہور نہیں
چہرہ افروز کائنات سہی
بادۂ ہوش میں سرور نہیں
لاکھ آزادِ رسم وراہ سہی
عشق بیگانۂ شعور نہیں
زندگی، آہ زاہدِ ناداں
داغِ دل ہے جبیں کا نور نہیں
رَوش اک خواب ہی سہی لیکن
تیری چشمِ کرم سے دور نہیں

(سنہ ۳۵ء)

یہ شب بھر، جو آنکھوں کی خونباریاں ہیں
نسیمِ محبت کی گل کاریاں ہیں

ہے گرمِ سفر کاروانِ جدائی
پُراسرار راتیں ہیں بیداریاں ہیں

تمنّا خطا، جُرم ترکِ تمنّا
خطا کاریاں ہی خطا کاریاں ہیں

وہ چشمِ فسوں ساز سب جانتی ہے
کہاں تک محبت کی خودداریاں ہیں

خدا جانے کیا ہے مرادِ محبّت
ابھی تو دو عالم سے بیزاریاں ہیں

رَوشؔ! خود فراموشیوں کا یہ عالم
کسے بھول جانے کی تیاریاں ہیں

(۳۵ سنہ ء)

جہانِ شوق نہیں عالمِ خیال نہیں
ترے سوا تو کچھ اے حسنِ لازوال نہیں

سکونِ دل جو ملا بھی تو آہ کیا ہوگا
سکونِ دل تو مرے درد کا مآل نہیں

ازل سے حسن سے آمادۂ کرم، لیکن
ہنوز عشق کے لب پر کوئی سوال نہیں

گزر سکے تو گزر جا، ہر اک تصور سے
کوئی حجاب بجز پردۂ خیال نہیں

بہ اقتضائے محبت محال سمجھوں گا
اگر یہ سچ ہے کہ ملنا ترا محال نہیں

فنا پذیر مری زندگی سہی، لیکن
مری فنا بھی مرے عشق کا مآل نہیں

کہاں نصیب رَوشؔ! مہر و ماہ و انجم کو
وہ سوزِ دل کہ جو شرمندۂ زوال نہیں

(۳۵ سنہ ء)

عشق ہی کو زندگی کی داستاں سمجھا تھا میں
حُسن پر جو کچھ گزرتی ہے کہاں سمجھا تھا میں

اس تغافل نے اُٹھا ڈالا حجابِ درمیاں
جس تغافل کو حجابِ درمیاں سمجھا تھا میں

عشق نے اک آستانِ جاوداں پیدا کیا
زندگی کو سجدۂ بے آستاں سمجھا تھا میں

آج اُن اشکوں کو پاتا ہوں سرِ مژگانِ دوست
جن کو اب تک دامنِ دل پر گراں سمجھا تھا میں

یہ تو دل کے ایک گوشے میں سمٹ کر آگیا
دردِ محرومی کو دردِ بیکراں سمجھا تھا میں

تیری روپوشی نے بخشا عشق کو حُسنِ یقیں
دہر کو بُت خانۂ وہم و گماں سمجھا تھا میں

گوش بر آواز ہے کوئی حریمِ راز میں
نالۂ دل کو نوائے رائیگاں سمجھا تھا میں

چھوڑ بھی یہ ذکر اے دیوانۂ حُسنِ بہار
کس کے اندازِ تغافل کو خزاں سمجھا تھا میں

کیوں مجھے اب شکوۂ بے گانگی ہے اے رَوِش
کیوں بھری محفل کو اپنا رازداں سمجھا تھا میں

(سنہ ۳۴ء)

مسیحا کرے ناز برداریاں — عجب ہیں محبت کی بیماریاں

نہ بادہ نہ مینا، نہ شیشہ نہ جام — مگر تیرے مستوں کی میخواریاں

ہمیں بھی تو اب قدر دل کی ہوئی — سلامت رہیں یہ دل آزاریاں

بڑھاتے نہیں اہلِ ہمت، قدم — نہ جب تک مقابل ہوں دشواریاں

کہاں ہیں ہم اے نرگسِ نیم خواب — ہمیں کھو گئیں دل کی بیداریاں

ذرا بھی تو بدلے نہیں دل کے طور — کہاں تک کرے کوئی غمخواریاں

روشؔ! کون لے اب محبت کا نام
بڑی ذلتیں ہیں بڑی خواریاں

۴۳۸

تمناؤں کے اُن رنگیں گلستانوں سے گزرا ہوں
گماں ہوتا ہے جنّت کے خیابانوں سے گزرا ہوں

یکایک رُک گیا طوفانِ جام و ساغر و مینا
یہ کس پیماں شکن کے ساتھ میخانوں سے گزرا ہوں

مرے نقشِ قدم پر سر جھکایا ہے ستاروں نے
سحر کی روشنی لے کر شبستانوں سے گزرا ہوں

بنا دیتے ہیں جو ساحل کو بھی اک موجِ آوارہ
بہ آہنگِ سکوں ایسے بھی طوفانوں سے گزرا ہوں

سرودِ برہمن کو میں نے پہنچایا ہے کعبے تک
غزل خوانِ حرم بن کر صنم خانوں سے گزرا ہوں
مجھے یاد آگئی ہے داستاں فرہاد و خسرو کی
روشؔ جب آسماں بردوش ایوانوں سے گزرا ہوں

(۳۸ء)

وہ معصوم آنکھیں وہ مخمور آنکھیں
وہ برہم زنِ خیمۂ حور آنکھیں
غمِ دو جہاں کو چھپائے ہوئے ہیں
بہ ظاہر وہ مسرور، مسرور آنکھیں
مرے شوقِ پنہاں سے ربطِ نمایاں
وہ میری محبت سے مغرور آنکھیں
مری خلوتوں میں خراماں، خراماں
مری حیرتوں سے بہت دور آنکھیں
مجھے رازدانِ تجلّی بنا کر
جھکی ہیں وہ غارت گرِ طور آنکھیں
روشؔ! کیا کہوں مجھ سے کیا کہہ رہی ہیں
وہ رسمِ زمانہ سے مجبور آنکھیں

(مسوری جون ۳۷ء)

ہے جہاں تمکنتِ ناز ، وہاں ہم بھی ہیں
حُسن خود بیں تری جانب نگراں ہم بھی ہیں

اور کچھ تو نہیں معلوم، مگر ہے یہ یقیں
جانبِ جلوہ گہِ دوست ، رواں ہم بھی ہیں

کیا کوئی فرض ہے، اس کم نگہی کی تاویل
کہ اسی بزم میں اے خوش نظراں ہم بھی ہیں

ہم نے بھی دل کو کیا آتشِ دوراں کے سپرد
اب تماشائی آشوبِ جہاں ہم بھی ہیں

لاکھ حائل ہوں حوادث کے نشیب اور فراز
جادہ پیما صفتِ آبِ رواں ہم بھی ہیں

جام و مینا کی طرف ہاتھ بڑھائیں، توبہ
روشناسِ نگہہ پیرِ مغاں ہم بھی ہیں

ہم سے وابستہ ہیں شاید یہ مصائب کے پہاڑ
دوشِ کونین پہ اک بارِ گراں ہم بھی ہیں

کچھ زمانے کی نگاہیں بھی ہیں محدود روش
کچھ زمانے کی نگاہوں سے نہاں ہم بھی ہیں

(سنہ ۳۹ء)

اشتیاقِ دید کی رسوائیاں
بن گئیں رُخ پر ترے رعنائیاں،

بھول جاؤ گے یہ بزم آرائیاں
کیا کہوں، کیا ہیں مری تنہائیاں

کھل نہ جائے پردۂ شوقِ نمود
اک جھلک، اور سو حجاب آرائیاں

زندگی اُس کی ہے بس، اے سروِ ناز
پڑ گئیں جس پر تری پرچھائیاں

آخرش! تصویرِ جاناں بن گئیں
کچھ پریشاں سی خیال آرائیاں

کس نے آنکھیں، پائے ساقی پر ملیں
میکدہ لینے لگا، انگڑائیاں

بڑھ گئیں منزل سے آگے لغزشیں
رہ گئیں تھک کر وفا پیمائیاں

ہے یہ سب رعنائیٔ حُسنِ خیال
کس نے دیکھی ہیں تری پرچھائیاں

تو بھی رخصت! اے ہجومِ آرزو
آج تنہا ہیں مری تنہائیاں

ہیں فروغِ خلوتِ دل تک رَوِش
زندگی کی انجمن آرائیاں

(۳۷ سنہ ء)

ہے شرطِ ادب، جادۂ تسلیم و رضا میں
سو منزلیں طے ہوتی ہیں اک لغزشِ پا میں

کچھ اور طلب کرنے کا اب ہوش ہے کس کو
ہے گوشۂ دامانِ کرم، دستِ دُعا میں

یہ برقِ نشیمن بھی ہے اک جلوۂ محبوب
اک شمع تو روشن ہوئی تاریک فضا میں

اے غیرتِ خود دار یہ ساحل بھی ہے زنجیر
اس کو بھی ڈبو دے اسی گردابِ بلا میں

آتش کدۂ سود و زیاں سرد ہے اے دوست
جنت سمٹ آئی ترے دامن کی ہوا میں

میخانے میں ہم نے تو روش آج یہ دیکھا
باقی ابھی کچھ لوگ ہیں اربابِ صفا میں

مارچ
(۵۳ سنہ ء)

یہ اہلِ ہوش دیوانے بہت ہیں — اس آبادی میں ویرانے بہت ہیں

سنبھلنا، اے غرورِ تشنہ کامی! — بہکنا ہے تو میخانے بہت ہیں

مہ وخورشید وانجم، لالہ وگل، — مجھے یہ چند پیمانے بہت ہیں

حقیقت دیکھئے کب دل نشیں ہو — زبانوں پر تو افسانے بہت ہیں

ذرا اے شمع ضبط سوزِ پنہاں — ابھی محفل میں پروانے بہت ہیں

برہمن کش مکش میں کھو گیا ہے — صنم کم ہیں، صنم خانے بہت ہیں

روشؔ اس شہر باتمکیں میں ہشیار
یہاں ذی ہوش دیوانے بہت ہیں

رگوں میں شعلۂ حسرت، نہ برقِ آرزو دل میں
کہاں سے روشنی ہو ان خردمندوں کی محفل میں
ابھی اے ہم سفر! حدِّ نظر سے دور ہے منزل
نہ کھو جانا کہیں نزدیکیٔ آثارِ منزل میں
سفینہ اہلِ حق کا یوں بھی طوفانوں سے گزرا ہے
کہ موجیں سر جھکا کر چھپ گئیں دامانِ ساحل میں
مزاجِ شرک سے کیا واسطہ اہلِ محبت کو
زبانِ عشق پر وہ بات آتی ہے جو ہو دل میں

عجب عالم گزرتا جا رہا ہے سننے والوں پر
سکوتِ ناز کا بھی رنگ ہے افسانۂ دل میں

روش اس ضد کو کیا کہیئے کہ جب محفل میں ہم پہنچے
وہی غارت گرِ محفل نہیں تھا اپنی محفل میں

(۱۹۵۲ء)

کبھی یوں بھی وہ تزئینِ مکاں ولامکاں کر لیں
شریکِ حسنِ محفل، عشق کی تنہائیاں کر لیں

نقابِ راز اک دن تیرے دیوانے الٹ دیں گے
یہ اہلِ ہوش کچھ دن تو خیال آرائیاں کر لیں

بس اب تو بادہ و مینا سے اتنا ربط باقی ہے
کہ تیرا نام لے کر زہرِ غم کو نوشِ جاں کر لیں

حرم نے کر دیا ہے محرمِ آدابِ نظّارہ
چلیں، اب دیر میں نظّارۂ حُسنِ بُتاں کر لیں

نہیں معلوم، کل کیا پوچھ لیں وہ مہرباں ہو کر
مکمل آج سب محرومیوں کی داستاں کر لیں

شریکِ غم بنایا حُسن کو جن کی نزاکت نے
یہ حسرت ہے کہ اُن لمحاتِ غم کو جاوداں کر لیں

روش! گر شاملِ آدابِ منزل ہے بھٹکنا بھی
تو اچھا ہے کسی رہزن کو خضرِ کارواں کر لیں

کیوں تشنۂ شوق تک رہے ہیں
ساقی کے قدم بہک رہے ہیں

یہ وادیٔ گمرہانِ دل ہے
کیوں خضر یہاں بھٹک رہے ہیں

کیا کام ہے ہم سے تشنگی کو
پیمانے یونہیں چھلک رہے ہیں

تاریکیٔ شب کا شور کیوں ہے
تارے تو بہت چمک رہے ہیں

آنکھوں میں اب آ نہ جائیں آنسو
ہم دیر سے ان کو تک رہے ہیں

خونابہ فشاں ہیں دیدہ و دل
کیا جام و سبو چھلک رہے ہیں

بس ایک ہی سمت ہیں نگاہیں
ہر چند قدم بھٹک رہے ہیں

دیکھو تو روشؔ ! ذرا سنبھل کر
آدابِ نظر بہک رہے ہیں

(۹)

عطیۂ نگہِ دل ستاں ملا مجھ کو
زہے نشاطِ غمِ جاوداں ملا مجھ کو

تھی ایک سجدۂ بے آستاں حیات مری
ہزار شکر ترا آستاں ملا مجھ کو

بہک گئے ہیں جہاں بھی قدم وہیں اے دوست
جھکا ہوا سرِ کون و مکاں ملا مجھ کو

وہ حُسن جس کو بہاروں میں بار رہا ڈھونڈا
بدل بدل کے لباسِ خزاں ملا مجھ کو

مرا تو حال ہی کیا ہے مرا تو ذکر ہی کیا
ترے سکوں میں بھی رنگِ فغاں ملا مجھ کو

ہزار دیر و حرم ہیں سجود آمادہ
جبیں ملی کہ ترا آستاں ملا مجھ کو

شرف عطا جو کیا تو نے ہم کلامی کا
زمانہ، منتظرِ داستاں ملا مجھ کو

مری غزل ہے روشؔ بادۂ لبِ لعلیں
غزل سے نشۂ رطلِ گراں ملا مجھ کو

(۱۹۴۰ء)

مجھے تلاش ہے جس کی کہاں ملا مجھ کو
یقیں بھی زینتِ بزمِ گماں ملا مجھ کو

ہنوز منزلِ دل کا نشاں نہیں معلوم
غبارِ راہ ہر اک کارواں ملا مجھ کو

کوئی بتا نہ سکا رازِ تشنہ کامیٔ شوق
خموشِ میکدۂ دوجہاں ملا مجھ کو

فرازِ عشق ہے یکسر، اشارۂ پرواز
نہ اس فضا میں کوئی آشیاں ملا مجھ کو

مجھے جنونِ وفا سے بڑی امیدیں تھیں
یہ مرحلہ بھی مگر رائیگاں ملا مجھ کو

ہے ایک نکہتِ آوارہ زندگی میری
جو مجھ سے دور ہے وہ گلستاں ملا مجھ کو

ہزار بار، غمِ آگہی نے ٹھکرایا
ہزار بار جو رطلِ گراں ملا مجھ کو

ازل سے محوِ طوافِ دلِ حزیں ہوں روشؔ
دلِ حزیں میں وہ آرامِ جاں ملا مجھ کو

(سنہ ۴۰ء)

وہ کونسی محفل ہے یہ رسوا نہ جہاں ہو
اب ہوش میں آئے دلِ دیوانہ جہاں ہو

اُس بزم میں کیا ذکر ہے بیتابیٔ دل کا
خود شمع بھی ہم صورتِ پروانہ جہاں ہو

بھولے سے پہنچ جاتے ہیں ہم تیری طلب میں
کچھ تذکرۂ کعبہ و بُت خانہ جہاں ہو

خود دیدہ و دل جام و سبو ہوں تو عجب کیا
ساقی کوئی غارت گرِ میخانہ جہاں ہو

اُس بزم میں ہم عرضِ تمنّا کے ہیں مشتاق
بے بات بھی اِک حرف کا افسانہ جہاں ہو

ہنستے ہوئے گزرے ہیں وہاں سے بھی روشؔ ہم
دنیا کا ہر انداز حریفانہ جہاں ہو

(۳۷ء)

یہ کیا کہوں کہ نگاہِ روش میں کیا ہے تو
ہر استعارۂ رنگیں کی انتہا ہے تو

محبّت ایک بڑا مُدّعا ہے فطرت کا
ہزار شکر، محبّت کا مدعا ہے تو

بس اس خیال سے دنیا بدل گئی میری
کہ میرے خوابِ محبّت کی ابتدا ہے تو

خدا وہ دن نہ کرے، میں رہوں نہ اس دن تک
کہ جب مجھے یہ گماں ہو کہ بے وفا ہے تو
کہاں کہاں ترا جلوہ پکارتا ہے مجھے
جو بن گئی ہے مری روح وہ صدا ہے تو
نہ کیوں طلوعِ محبت کہے روش تجھ کو
کہ سینۂ شبِ مہتاب کی دعا ہے تو

(سنہ ۲۶ء)

ہم چلے تیرے تغافل کو خبر ہو کہ نہ ہو
شمع خاموش ہے ہنگامِ سحر ہو کہ نہ ہو
تھک کے بیٹھا ہوں سرِ جادۂ فرقت اے دوست
سوچتا ہوں یہ تری راہ گزر ہو کہ نہ ہو
دامنِ اہلِ محبت تو نہیں ہے خالی
اشکِ گل رنگ ہی کیا کم ہے گہر ہو کہ نہ ہو
زندگی تیرے تغافل پہ مٹی جاتی ہے
یہ تغافل بھی کہیں بارِ دگر ہو کہ نہ ہو
دل میں ذرّوں کے اترتی ہیں نگاہیں میری
آسمانِ مہ و انجم پہ گزر ہو کہ نہ ہو
لمحہ لمحہ، رخِ قدرت ہی برافگندہ نقاب
اب بھی تسکینِ اسیرانِ نظر ہو کہ نہ ہو

ہاں ترے وعدۂ فردا کا یقیں ہی مجھ کو
ہمنوا سلسلۂ شام وسحر ہو کہ نہ ہو
کب ہمیں شکوۂ دوراں تھا کہ ہو آج روشؔ
یوں طلسمِ غمِ دوراں سے مفر ہو کہ نہ ہو

سوالِ عشق پر تا حشر چپ رہنا پڑا مجھ کو
ہر اک الزام کو ہنستے ہوئے سہنا پڑا مجھ کو
کبھی مغرور طوفانوں کو بھی ٹھکرا دیا میں نے
کبھی اک موج غم کے ساتھ ہی بہنا پڑا مجھ کو
یقینِ عشق کو آگے بڑھایا ہر تغیّر نے
جہانِ بے وفا کو باوفا کہنا پڑا مجھ کو
سکونِ دل بڑی دولت سہی اے ہم نشیں لیکن
سکوں پاکر بھی اکثر مضطرب رہنا پڑا مجھ کو
زمانہ کس قدر بیگانۂ رسم محبت تھا،
یہاں تو خود سے بھی ناآشنا رہنا پڑا مجھ کو
روشؔ! اس بزمِ رنگیں میں سکوتِ غم کا افسانہ
کہا جاتا نہ تھا مجھ سے مگر کہنا پڑا مجھ کو

(۴۳ سنہ)

وہاں کوئی تمنا ہے نہ حسرت ہے جہاں تم ہو
بہ ہر عالم محبت ہی محبت ہے جہاں تم ہو

ہر اک لمحہ کسی روپوش نکہت سے مہکتا ہے
ہر اک احساس اک خوابِ لطافت ہی جہاں تم ہو

فروغِ شام ہو، نورِ سحر ہو، نشّۂ شب ہو
وہاں سب کچھ تمھاری ہی حکایت ہی جہاں تم ہو

ہجومِ رنگ و بو ہے جنبشِ داماں سے رقصیدہ
زمیں پر اہتمامِ خلد و جنت ہے جہاں تم ہو

سکونِ دل وہاں اک فرشِ پا اندازِ محفل ہے
دلِ بے تاب ہی شایانِ خلوت ہی جہاں تم ہو

مرے خوابِ پرستش کو مکمل کر دیا تم نے
وہاں ہر سانس ہم رنگِ عبادت ہی جہاں تم ہو

نگاہیں پُر سکوں، دل باخبر، حیراں تمنائیں
مکمل حُسنِ آدابِ محبت ہے جہاں تم ہو

قدمبوسِ روش ہے آج بزمِ زہرہ و پرویں
یہ دیوانہ، غزل خوانِ محبت ہے جہاں تم ہو

(سنہ ۳۵ء)

سکوں ہے ہمنوائے اضطراب آہستہ آہستہ
محبت ہو رہی ہے کامیاب آہستہ آہستہ

عجب عالم ہے آغازِ سرورِ عشق کا عالم
اٹھے جیسے افق سے ماہتاب آہستہ آہستہ

حجابِ ضبط، تارِ ناامیدی، زخمۂ حسرت
خموشی بن گئی خود ہی رباب آہستہ آہستہ

سرشکِ غم کبھی شمعِ جدائی کو بجھا دیں گے
یہی تارے بنیں گے آفتاب آہستہ آہستہ

ابھی محسوس کیا ہو گی حوادث کی سبک گامی
رُکے گا، کاروانِ انقلاب آہستہ آہستہ

بالآخر کیفِ غم نے، منظرِ ہستی بدل ڈالا،
سرِ میخانہ پہنچا ہے سحاب آہستہ آہستہ

خرابِ نرگسِ مستانہ آخر ہو گیا، زاہد
رسا ہوتی ہے تاثیرِ شراب آہستہ آہستہ

نشاطِ آرزو، خوابِ تمنّا، دردِ محرومی
محبّت نے اٹھائے سب حجاب آہستہ آہستہ

بہ ہر عنواں مسلسل چھیڑ ہے اب اُن کے جلووں سے
بہک نکلی نگاہِ باریاب آہستہ آہستہ

رَوشؔ رازِ محبّت آج بھی ہے رازِ لاینحل
غلط ثابت ہوئے سارے جواب آہستہ آہستہ

(۱۹۳۸ء)

عہد و پیماں کر کے پیمانے کے ساتھ
عمر گزری، تیرے میخانے کے ساتھ

زندگی بھی جی چُرا کر رہ گئی،
کون مرتا تیرے دیوانے کے ساتھ

یہ نہ پوچھو رہ نوردانِ حرم،
کون چھوٹا ہم سے بتخانے کے ساتھ

خود بخود حل ہو گئے کتنے سوال
وقت کے خاموش افسانے کے ساتھ

اے فقیہِ شہر! کیا اس کا علاج
چشمِ ساقی بھی ہے پیمانے کے ساتھ

ہوشمندوں پر گراں ہیں اے رَوشؔ
ان کی باتیں تجھ سے دیوانے کے ساتھ

(۱۹۴۸ء)

شرابِ ناب کو دے کر لباسِ پیمانہ
چھپا لیا تری آنکھوں نے رازِ میخانہ

یہ تشنگی ہے کہ فیضانِ پیرِ میخانہ
کہ ہر نظر میں کھنچ آتی ہے روحِ میخانہ

ابھی یہ کون خراماں تھا بے نیازانہ
ہنوز اپنی جگہ پر نہیں ہے بُتخانہ

غمِ وفا تو کہانی نہ تھا مگر، اے دل
بنا دیا تری خاموشیوں نے افسانہ

ہر ایک ذرّہ شریکِ غم و مسرّت ہے
ملا نہ دشتِ محبّت میں کوئی بیگانہ

وہ لب ہلیں تو بکھر جائیں نغمہ ہائے ارم
وہ آنکھ اٹھے تو برس جائے کیفِ میخانہ

ہوائے خلد بھی آوارۂ جنوں ہے جہاں
گزر چکا ہے وہاں سے بھی تیرا دیوانہ

نگاہِ یار تجھے بے نیازیوں کی قسم
کھلے نہ رازِ سکوتِ نیازمندانہ

ہوا نہ تکملۂ حسرتِ دلِ رنگیں،
تمام عمر چھلکتا رہا یہ پیمانہ

ہر اجتناب ہے در پردہ التفات روش
حدیثِ چشمِ تغافل، تمام افسانہ

(۱۹۳۵ء)

زندگی خلد نما ہے دلِ آزاد کے ساتھ
خوب ہے آبِ رواں، سایۂ شمشاد کے ساتھ

غافلِ جذبِ محبّت کو خبر بھی نہ ہوئی
کون ناشاد رہا ہے دلِ ناشاد کے ساتھ

اور بھی چند جہاں عشق نے پامال کئے
عقل الجھی ہی رہی عالمِ ایجاد کے ساتھ

دے ہوا اور ذرا دامنِ خود داری کو
پھونک دے فکرِ نشیمن کو بھی صیّاد کے ساتھ

کون توہینِ غمِ عشق گوارا کرتا،
تابِ فریاد بھی رخصت ہوئی فریاد کے ساتھ

کیوں خرابِ ہوسِ کوہ کنی ہے ناداں
سرِ فرہاد بھی ہے، تیشۂ فرہاد کے ساتھ

ہے سزاوار تجھے جادوئے گفتار روش
گفتگو عشق کی اور اُس ستم ایجاد کے ساتھ

(۱۹۳۷ء)

رہا پیہم حوادث کا نشانہ
نکھرتا ہی گیا رنگِ زمانہ

سُن اے بے تابِ تعمیرِ نشیمن،
قفس کی ابتدا ہے آشیانہ

تغافل کے بہانے ہیں ہزاروں
مگر تقصیرِ شوقِ غائبانہ

سکھا دیتی ہے خاموشی محبت
بنا دیتی ہے دنیا اک فسانہ

یہ دن کاٹے سے جو کٹتے نہیں ہیں
انھیں بھی بھول جائے گا زمانہ

جہاں بھی تیرے دیوانے ٹھہر جائیں
وہی ہے زندگی کا آستانہ

یہ تنکے شعلۂ پرواز تک ہیں
قفس کس کا، کہاں کا آشیانہ

نہ دُہرایا گیا صبحِ ازل سے
مری شبہائے فرقت کا فسانہ

ہم اُس محفل میں اب بھی اجنبی ہیں
مبارک، اے نگاہِ محرمانہ

رَوِش! یہ دَورِ آہنگِ غزل ہے
کہاں تک اب سکوتِ شاعرانہ

(۴۷ء)

رواں دواں ہے جہاں، عزمِ تیز گام کے ساتھ
سفر ہے شرط یہاں راحتِ قیام کے ساتھ

زبانِ عشق نہیں ہے شکستگی دل کی،
طلوعِ جام ہے لازم شکستِ جام کے ساتھ

خرد سلیقۂ آدابِ عشق کیا جانے
زباں خموش ہوئی ہے کسی کے نام کے ساتھ

یہاں بس ایک اسی پر نگاہ ٹھہری ہے
وہاں ہجومِ تغافل ہے اہتمام کے ساتھ

خلوصِ دل ہی تو ہے جاوداں وگرنہ یہاں
ہزار رنگ بدلتے ہیں صبح و شام کے ساتھ

وہ کیا کسی سے جھکیں گے جو سر بلند رہے
تغیرات کی شمشیرِ بے نیام کے ساتھ

ہمیں ہی ضد ہے رَوِش کچھ وگرنہ ساقی نے
ہزار بار دیا جام احترام کے ساتھ

مارچ
(سنہ ۵۰ء)

(ی)

زمانے سے ملے گی داد کیا دردِ غریباں کی
یہاں تو ٹھوکروں میں زندگی تلتی ہے انساں کی

نگاہوں نے طلوعِ حریت کا خواب دیکھا تھا
پلٹ کر کھو گئیں تاریکیوں میں شامِ زنداں کی

یہ نوکِ نیزۂ غم سینۂ صد چاک انساں پر
زمانہ لکھ رہا ہے اک نئی تاریخ انساں کی

خزاں کو بھی کبھی اس درجہ افسردہ نہ دیکھا تھا
یہ عہدِ گل میں کیا صورت نظر آئی گلستاں کی

نہ پوچھ اے ناخدا اُس کشتیٔ برباد کی عظمت
کہ جس نے غرق ہو کر آبرو رکھ لی ہے طوفاں کی

یہ دل کش استعارہ ہے عطیہ تیری زلفوں کا
کہانی اس قدر رنگیں کہاں تھی کفر و ایماں کی

روِش! جن پر خزاں کی آتش افشانی کو دعویٰ ہے
یہی شعلے امانت ہیں چراغانِ بہاراں کی

(سنہ ۳۴ء)

غمِ پنہاں کی نہ ہو جائے کہیں پردہ دری
آہ رہنے دو یہ اندازِ پشیماں نظری

مجھ تک آتی تھی کہاں نکہتِ گیسوئے نگار
وحشتِ عشق، مبارک غمِ شوریدہ سری

یہ حجاباتِ محبت کے لئے لازم ہیں
کچھ تری کم نگہی ہے نہ مری کم نظری

بھیجتا ہے کوئی ہر روز مجھے تازہ پیام
راستہ بھول ہی جاتی ہے نسیمِ سحری

مدتوں سے ہے کسی وادیٔ خاموش میں عشق
نالۂ نیم شبی ہے نہ فغانِ سحری

آ، کہ اب حسرتِ دیدار بھی ہے مرگ پذیر
چشم افسردہ ہے ہم رنگِ چراغِ سحری

کششِ شوق تو اب تک رہی محرومِ اثر
کس نے دیکھا ہے مآل کششِ بے اثری
اُس نے کچھ سوچ کے سب پردے اٹھا ہی ڈالے
کر گئی آج بڑا کام مری بے خبری
کیا غمِ عشق بھی مانوس تلافی ہے روشؔ!
نگہِ ناز ہے کیوں مضطربِ چارہ گری

(۳۵ء)

ہوسِ خلوتِ خورشید وشاں اور سہی
دور ہے صبح تو یہ خوابِ گراں اور سہی
کچھ شکستہ سا ہے رنگینیٔ و نکہت کا طلسم
یہی بیدادِ خزاں ہے تو خزاں اور سہی
یوں تو ہر سانس ہے آلودۂ زہرابِ حیات
ہم نشیں! آج تو اک رطلِ گراں اور سہی
مرحلے دانشِ حاضر کے تو سب ختم ہوئے
اک قدم جانبِ اقلیمِ گماں اور سہی
میری پلکیں بھی گراں بار رہی ہیں اے دوست
اب یہ آنسو ترے دامن پہ گراں اور سہی
یوں بھی ہیں تم سے محبت کو ہزار اُمیدیں
تم کو خود جس کا یقین ہے وہ گماں اور سہی

جلوۂ حُسنِ بتاں سے ہے اگر دل کا زیاں
اے خداوند! مرے دل کا زیاں اور سہی
ہم سخن کل تو سب اصنامِ وطن تھے ہم سے
آج ہم اہلِ محبّت کی زباں اور سہی
ہم نشینوں کو تو ہے عشرتِ نظارہ نصیب
دور سے ہم تری جانب نگراں اور سہی
سیکڑوں رُخ ہیں محبت کی کہانی کے روش
ایک اندازِ حدیثِ دگراں اور سہی

وہ سادگیٔ ناز، وہ معصوم نگاہی
اعجاز ہے من جملۂ آیاتِ الٰہی
کیا جرمِ محبّت سے بھی انکار ہے تجھ کو
معلوم ہے اے دل تری ناکردہ گناہی
کچھ میری خموشی بھی تھی غمّازِ محبت
اُس پر ترے اندازِ تغافل کی گواہی
وہ خود بھی تو ہیں قافلۂ شوق میں شامل
تنہا تو نہیں قافلۂ شوق کا راہی
تعمیرِ محبّت کو یہ آغازِ مبارک
ہر عالم محسوس ہے بے تابِ تباہی

اِک جلوۂ یزداں، ترے عارض کی تجلّی
خود پردۂ کعبہ تری زلفوں کی سیاہی
فرصت ہے کسے شکوۂ گردابِ الم کی
دل ہے تو ہزاروں ابھی طوفانِ تباہی
خاکِ درِ محبوب سے نسبت ہے رَوِش کو
قدموں سے ذرا دور رہے افسرِ شاہی

(سنہ ۳۶ء)

زخم خوردہ دلِ کونین ہے اللہ غنی
کہیں محدود بھی ہے عشق کی ناوک فگنی
چہرۂ دشت کو افسردہ و ویراں پاکر
دل مرا بھول گیا دردِ غریب الوطنی
ترک سے سلسلۂ ذوق طلب ہے قائم
بت پرستی کا تقاضا ہے مری بت شکنی
ہمہ مستی ہمہ بادہ ہمہ مینا ہمہ جام
ساقیٔ گلبدن و نشۂ گل پیرہنی
یہی دستورِ محبت ہے تو دائم آباد
محفل کم نگہی، انجمن کم سخنی
پیار کرتا ہوں غمِ دل کو تو آتا ہے خیال
غمِ دوراں کی نہ ہو جائے کہیں دل شکنی

سرِ فرہاد نے یہ رازِ نہاں فاش کیا
کہ شکستِ دلِ کہسار نہیں کوہ کنی

جرمِ اظہارِ محبت ہو کہ تقصیرِ سکوت
مجرمِ عشق بہ ہر حال ہے گردن زدنی

نشۂ عشق حوادث سے فزوں ہوتا ہے
رہرو شوق ہے خود منتظرِ راہ زنی

زندگی کوہ گراں تیشۂ فرہاد ہے عشق
حاصلِ عمرِ ابد، یک نفسِ کوہ کنی

میں بھی گزرا ہوں روش! وادیٔ فرقت سے مگر
نہ مرا درد ہوا شیفتۂ نعرہ زنی

(سنہ ۳۶ء)

کیا تھا جس نے تمھیں مائلِ فراموشی
وہ داستاں بھی ہوئی اب سپردِ خاموشی

یہ کائنات ہے یا حُسنِ اجتنابِ جمال
یہ زندگی ہے کہ اک حسرتِ ہم آغوشی

مری نگاہ میں ہے خوابِ نرگسِ مخمور
مجھے فریب نہ دے اے فسونِ مدہوشی

بہانہ جو ہے مری لغزشوں کا ہر عالم
کہ ہاتھ آئے کہیں دامنِ خطا پوشی

چھپا کے حُسنِ تغافل کو پردۂ شب میں
دلِ خموش سے کرتا ہے کون سرگوشی
قریبِ دامنِ دل دامنِ حبیب بھی ہے
کدھر کا عزم ہے اے شعلۂ وفا کوشی
بہت عجیب یہ درمانِ تلخیٔ غم ہے
شرابِ ہوش میں ہلکا سا زہرِ مدہوشی
تجھے ہے حُسن سے کیوں شکوۂ حجاب روش
تری نگاہ تو خود ہے جوازِ روپوشی

(۳۹ سنہ ء)

سُنا ہے آوارگانِ الفت کو دادِ آشفتگی ملے گی
سکونِ دل کو ہوائے زلفِ نگار کی برہمی ملے گی
ابھی سے شکوہ غلط ہے زہرابِ زندگانی کی تلخیوں کا
ابھی تو اے دوست تلخیٔ غم میں تلخیٔ عیش بھی ملے گی
غروبِ خورشید پر رہے گا فروغِ شب کا مدار کب تک
یہ سوچتا ہوں کہ ان ستاروں کو، کب نئی زندگی ملے گی
وہ صبحِ جنت کہ جس نے زاہد کو دین و دنیا سے کھو دیا ہے
کہیں ملے گی تو میکدے کا طواف کرتی ہوئی ملے گی
یہی نشیمن، تری نگاہوں کو جس نے محدود کر دیا ہے
اسی نشیمن کے آئینے میں قفس کی تصویر بھی ملے گی

کہاں کہاں ہم سفر رہے ہم وہی ہے بیگانگی کا عالم
کسے خبر تھی کہ زندگی بھی بہ صورتِ اجنبی ملے گی
شکستِ دل سے سکونِ دل کا معاملہ کیا ہو کون جانے
جہاں جہاں یہ سوال ہوگا جواب میں خامشی ملے گی
بلند ہوگا اسی شبستاں کے دوش پر صبحِ نَو کا پرچم
انھیں اندھیروں سے بزمِ گیتی کو ایک دن روشنی ملے گی
روشؔ! محبّت کی جلوہ گاہوں میں ظلمتِ وقت کا گزر کیا
بڑھے چلو تم کہ ہر قدم پر خلوص کی روشنی ملے گی

(۱۹۵۱ء)

خیال و خواب ہوئی آرزو کی خلّاقی
بتوں کو مجھ سے وہی اجتناب ہے باقی
الٰہی گلشکدۂ دہر کو ہوا کیا ہے
نہ بوئے نازِ تغافل نہ رنگِ مشتاقی
یہ کون سب سے الگ سر جھکا کے بیٹھ گیا
یہ کس کو ڈھونڈ رہی ہے نوازشِ ساقی
کتابِ عمر کا حاصل ہو ایک حرفِ وفا
یہاں فضول ہو اندیشۂ کم اوراقی
یہ ایک گوشۂ دل بھی، بہت ہو میرے لئے
مجھے معاف کریں! عارفانِ آفاقی
روشؔ! وہ رندِ خراباتؔ اور یہ قسمت
تجلّیٔ رُخِ ساقی و خلوتِ ساقی

(۱۹۴۵ء)

جمالِ دیر و حرم میں وہ دل کشی نہ رہی
اب آبروئے فریبِ نگاہ بھی نہ رہی

دلِ حزیں کو تلاشِ خلوص ہے بے سُود
کہ اس دیار میں شاید یہ رسم ہی نہ رہی

ہے ایک حادثہ تو یہ دورِ بیداری
کہ اب وہ محفلِ خواب و خیال بھی نہ رہی

جو ہو سکے تو غمِ دل کو لازوال بنا
یہ صورتِ غمِ دوراں رہی رہی نہ رہی

ابھی یہ راز، نئے میکشوں کو کیا معلوم
شراب ہی نہیں باقی کہ تشنگی نہ رہی

کہاں پہنچ کے لُٹا کاروانِ مہر و وفا
کہ دوستی سے بہت دور دشمنی نہ رہی

نگار خانۂ تہذیبِ نو کے دیوانو!
رہے گا کیا جو محبّت کی سادگی نہ رہی

ہم اپنے حال پہ حیراں ہیں، اجنبی کی طرح
کہ یاد صورتِ غمہائے زندگی نہ رہی

فروغِ حُسنِ گماں ہی بہت ہے ہم کو رؔوش!
چراغِ دانشِ حاضر میں روشنی نہ رہی

(مارچ ۱۹۵۱ء)

اٹھ گیا آج نظر سے یہ حجاب اے ساقی
دلِ خوں گشتہ ہے، مینائے شراب لے ساقی

کیا گلہ تیرے تغافل کا مگر سوچ یہ ہے
بوالہوس بھی ہوئے شایانِ خطاب اے ساقی

توڑ دے مصلحتِ وقت کے پیمانوں کو
نہ ملا خاک میں یہ بادۂ ناب اے ساقی

نذر کرتا ہوں ترا ساغرِ لبریز تجھے
لے، یہ ہے تیرے تغافل کا جواب اے ساقی

کیوں گدایانِ خزاں چیں بہ جبیں ہیں ہم سے
ہم نے دیکھا ہے بہاروں کا عتاب اے ساقی

جانبِ گوشۂ آرام نظر ہو جن کی
کیا وہ اُلٹیں گے حوادث کا نقاب اے ساقی

اہلِ دُنیا تو رہے درپئے تعمیرِ بہشت
اور دنیا ہوئی زندانِ عذاب اے ساقی

ہے یہ اک گوشۂ میخانہ غنیمت کہ یہاں
زندگی خود ہے برافگندۂ نقاب اے ساقی

شکر صد شکر، روِش حاضرِ میخانہ ہوا
گرچہ آسان تو نہ تھی راہِ صواب اے ساقی

زندگی بادہ ہے، ہر سانس ہے جام اے ساقی
جاوداں ہے ترے مستوں کا نظام اے ساقی

چشمۂ صبح سے جاری ہے وہاں جوئے شراب
اور یہاں وردِ زباں ہے ترا نام اے ساقی

ہیں سزا وارِ مئے عشق، ترے دیوانے
ہوشمندوں پہ یہ آتش ہے حرام اے ساقی

سب تری نرگسِ مخمور کا افسانہ ہے
کہیں صہبا ہے نہ مینا ہے نہ جام اے ساقی

ترے رندوں سے ہوا رنگِ خرابات کچھ اور
دنگ ہیں گردشِ دوراں کے غلام اے ساقی

زندگی، اک شبِ تاریک ہوئی جاتی ہے
ہاں، مہ و مہر سے ترشا ہوا جام اے ساقی

روشِ گوشہ نشیں کے لئے ارشاد ہے کیا
آج تو بزم میں ہے لغزشِ عام اے ساقی

(۴۲ء)

زرا کچھ اور تند و تیز صہبائے کہن ساقی
یہاں تو ہوش میں ہے انجمن کی انجمن ساقی

خس و خاشاک کا انبار کب تک صحنِ گلشن میں
ہوائے دامنِ گلشن ہوئی آتش فگن ساقی

حرم صبحِ محبت ، آرزو افروز بُت خانہ
یہ کیوں تاریک ہے اہلِ نظر کی انجمن ساقی

کلاہیں کج تو ہیں لیکن فراغِ دل سے بیگانہ
کہاں سے لائیں اہلِ ہوش تیرا بانکپن ساقی

یہ تہذیب زرافشاں جس نے صدہا روپ بدلے ہیں
اسی پرویز کے سر پر ہے خونِ کوہ کن ساقی

جہاں انسان سوز و درد سے محروم ہو جائے
کہیں اُس خُلد سے بہتر ہے یہ دار المحن ساقی

فروغِ زندگی کی وادیوں میں تیرے دیوانے
حوادث کو سمجھتے ہیں غبارِ پیرہن ساقی

بالآخر کاروانِ رنگ و بو گرمِ سفر ہوگا
شمیم گل کو کیا روکے گی دیوارِ چمن ساقی

بہانِ دل ہائے نازک کارِ سنگ و خشت کرتے ہیں
بہت دشوار ہے دراصل تعمیرِ وطن ساقی

روش نے شاہدِ گیتی کی زلفوں کو سنوارا ہے
اٹھائے ہیں حجابات رخِ دار و رسن ساقی

(اپریل ۱۹۵۱ء)

مہک رہی ہے مرے پیرہن میں بُو تیری
دکھا رہی ہے یہ کیا خواب، آرزو تیری

ادب خموش، تصور خموش، درد خموش
زبانِ حال سے رہتی ہے گفتگو تیری

ہے سر جھکائے ہوئے ساتھ کاروانِ ازل
کہاں چلی ہے مجھے لیکے جستجو تیری

مری نگاہ کو آدابِ شوق کیا آتے
سکھا گئی ہے نگاہِ رمیدہ خو تیری

حریمِ نیم شبی ہو کہ جلوہ گاہِ سحر
ترے روش کی عبادت ہی گفتگو تیری

(نومبر سنہ ۴۰ء)

(ہے)

آرزو نقشِ بے ثبات بھی ہے
اور صورت گر حیات بھی ہے

زینتِ زندگی سکوں ہی نہیں،
اس میں کچھ حسنِ حادثات بھی ہے

اے خدا! سب ہیں طالبانِ نجات
کوئی آزردۂ نجات بھی ہے

حُسنِ پنہاں کی دل فریبی میں
کچھ جمالِ تصورات بھی ہے

اک تغافل ہی کیا ہے دشمنِ جاں
شوخیٔ حسنِ التفات بھی ہے

جس کا دامن نہ ہو، ردائے سحر
کوئی اے شمع ایسی رات بھی ہے

تجھ سے منسوب، اے نشہِ خوباں
ہم غریبوں کی کائنات بھی ہے

خامشی، اک جہانِ راز، سہی
خامشی، دو دلوں کی بات بھی ہے

تیری زلفوں کی برہمی اے دوست!
وجہِ آرائشِ حیات بھی ہے

جزوِ موہوم کائنات سہی،
ذرہ خود ایک کائنات بھی ہے

مطمئن ہوں، کہ روزِ ہجر کے بعد
اک خوابِ گراں کی رات بھی ہے

اے روش! پاسِ وضع میں شامل
احترامِ تغیرات بھی ہے

(اپریل سنہ ۴۴ء)

جبیں پہ نورِ مسرت ہی آنکھ پر نم ہے
سرورِ عشق کا عالم عجیب عالم ہے

ہزار پردہ حائل ہے ایک حیرتِ شوق
جمالِ یار تجھے یہ نقاب کیا کم ہے

دیارِ لالہ و گل بھی نہیں مقامِ سکوں
ہنوز گرمِ سفر کاروانِ شبنم ہے

کہاں ہے سوختۂ بیداد اے تغافلِ ناز
کہ مدتوں سے وہی اجتنابِ پیہم ہے

مآلِ تلخیٔ عشرت سے بے خبر ہے حیات
ابھی تو شکوۂ آغازِ تلخیٔ غم ہے

فنا ہیں سب ترے مستوں کی بے نیازی سے
کہ ان کو فرصتِ ترکِ طلب ذرا کم ہے

سکوتِ ناز ہی ہم رنگِ نالۂ خاموش
اِدھر بھی ہے وہی عالم اُدھر جو عالم ہے

یہی ہے وقت روش، نذر کر متاعِ سکوں
ادائے زلفِ پریشاں کچھ اور برہم ہے

(اپریل سنہ ۵۲ء)

بہار آئی تو میخانے سے نکلے
بہک نکلے کہ بہکانے سے نکلے

حرم تک روشنی ہی روشنی تھی
ہم اس عالم میں بتخانے سے نکلے

پگھل کر بہ گئی زنجیر کونین
وہ شعلے آج پیمانے سے نکلے

نگاہِ مست نے دامن نہ چھوڑا
نکلنے کو تو میخانے سے نکلے

بہت پہلو، سکونِ زندگی کے
غمِ فردا کے افسانے سے نکلے

عجب کیا ہے کہ اس ظلمت میں! اے دوست
سراغِ شمع پروانے سے نکلے

روش! اپنا دلِ ناداں سلامت
ہزاروں کام دیوانے سے نکلے

(۱۹۴۸ء)

چاک اندیشۂ باطل کا گریباں کر دے
سینۂ شب سے عیاں صبح درخشاں کر دے

روشنیٔ سرِ ساحل تو ہوئی دور کی بات
بڑھ کے اس ظلمت طوفاں میں چراغاں کر دے

اے نسیم سحری توڑ دے زنجیرِ بہار
آج کانٹوں کو بھی گلشن میں خراماں کر دے

وہی ہمرازِ مشیت ہے جو ہر مشکل کو
شاملِ سلسلۂ زلفِ پریشاں کر دے

نہیں شایانِ محبت سر و ساماں کی تلاش
تجھ کو اللہ حریفِ سر و ساماں کر دے

ہاں یہ دنیا ترے افکار کا زنداں ہی سہی
ہو سکے تجھ سے تو آرائشِ زنداں کر دے
مے نہیں درد سہی، زہر سہی، جھوم کے پی
تیرا انکار نہ ساقی کو پشیماں کر دے
غمِ دوراں غمِ جاناں سے گزر کر اے دوست
آج ہر غم کو شریکِ غمِ انساں کر دے
امنِ ساحل تری کشتی کے لئے رہزن ہے
جس طرح ہو اسے ساحل سے گریزاں کر دے
لالہ و گُل میں بھی وہ سوزِ نہاں ہے کہ روش
بجلیوں کو جو گلستاں کا نگہباں کر دے

(دسمبر ۵۲ء)

تمہید تھی حجابِ تمنّا کہیں جسے
تکمیل ہے فسانۂ رسوا کہیں جسے
لانا پڑا ہے وعدۂ فردا پہ اعتبار
تم بھی وہی ہو جنّتِ فردا کہیں جسے
وہ زہر بھی شریکِ غمِ زندگی، سہی
اک چشمِ مہرباں کا اشارا کہیں جسے
فرشِ قدم ہے حُسنِ خراماں کے ساتھ ساتھ
وہ روشنی، کہ نور کا دریا کہیں جسے

شب زندہ دارِ خلوتِ دل کی ہر ایک رات
وہ رات ہے کہ خوابِ زلیخا کہیں جسے

کیا مرتبہ ہے خاک نشینانِ عشق کا
فرشِ قدم ہے بامِ ثریا کہیں جسے

غارت گرِ سکوں بھی ہے وجہ سکوں بھی ہے
وہ جاوداں خلش کہ تمنّا کہیں جسے

اک بوجھ دل پہ ہے بہ فراوانیٔ کرم
ایسا بھی اک کرم کہ گوارا کہیں جسے

اس نے رَوش کے ذوقِ محبت کو دیکھ کر
دل وہ دیا کہ درد کی دنیا کہیں جسے

(مارچ سنہ ۲۷ء)

محفلِ دہر پہ جنت کا گماں ہوتا ہے
حسن جب عشق کی جانب نگراں ہوتا ہے

سانس لے کر تری زلفوں کے گھنے سائے ہیں
سردِ آتش کدۂ سود و زیاں ہوتا ہے

کچھ مرا حال سناتی ہے مری خاموشی
کچھ تری نیم نگاہی سے عیاں ہوتا ہے

دل گوارا نہیں کرتا ہے شکستِ اُمّید
ہر تغافل پہ نوازش کا گماں ہوتا ہے

وہیں سنتے ہیں ستارے، ترے قدموں کی صدا
آخرِ شب، دلِ خاموش جہاں ہوتا ہے
خود لبِ شکر سے اک شکوۂ نازک ہے عیاں
ضبط جب حد سے گزرتا ہے فغاں ہوتا ہے
یہ ہوئی اب دلِ بے تاب و تواں کی حالت
التفاتِ نگہِ ناز گراں ہوتا ہے
کیا محبّت کے سوا ہے کوئی مقصودِ حیات
کون کہتا ہے محبّت میں زیاں ہوتا ہے
کشتیٔ وقت کچھ اس طرح رواں ہے کہ روش!
موجِ طوفاں پہ بھی ساحل کا گماں ہوتا ہے

(۱۹۳۵ء)

سوزِ غم روح میں یوں نور فشاں ہوتا ہے
چاند جس طرح گھٹاؤں میں رواں ہوتا ہے
زندگی حسن تغیر سے حسیں ہے شاید
جس کو کہتے ہیں یقیں حسنِ گماں ہوتا ہے
لذّتِ درد کہاں، فرصتِ گفتار کہاں
کہہ سکے کون، ترا درد کہاں ہوتا ہے
دل سی ہو جاتی ہے اک صورتِ بے نام قریب
جب کبھی تذکرۂ حسنِ بتاں ہوتا ہے
ہے یہ سب زینتِ محفل تری روپوشی سی
حُسن چھپتا ہے تو کچھ اور عیاں ہوتا ہے
پھر میسّر ہے روش عشرتِ گلگشتِ نشاط
ہم عناں پھر وہی شمشادِ رواں ہوتا ہے

(۱۹۳۵ء)

رو پوش حقیقت ہے جب تک افسانے بند نہیں ہوں گے
اسرارِ حرم آباد رہیں بُت خانے بند نہیں ہوں گے
اے اہلِ خرد مختار ہو تم، تعمیر کرو زنداں، لیکن
خود رقص کریں گی دیواریں دیوانے بند نہیں ہوں گے
یہ لالہ و گُل، ماہ و انجم، منہ نوچ نہ لیں واعظ تیرا
میخانے بند نہیں ہوتے، میخانے بند نہیں ہوں گے
خود شمعِ یقیں بن جائیں گے، ہنس ہنس کر جل جانے کے لئے
اوہام کے ظلمت خانوں میں پروانے بند نہیں ہوں گے
یہ طنز و ملامت کچھ بھی نہیں جز حرفِ محبت کچھ بھی نہیں،
دنیا ہے رَوش اور دنیا کے افسانے بند نہیں ہوں گے

(اپریل ۵۲ء)

کہاں تک، اب یہ افسانہ، فنا کیا ہے بقا کیا ہے
تجھے معلوم ہوتا کاش! وہ زلفِ رسا کیا ہے
دلِ خاموش ہی تجھ کو سکھا دے گا یہ اے زاہد
دعا کہتے ہیں کس کو اور حُسنِ مدعا کیا ہے
یکایک لڑکھڑا کر لالہ و گُل سے اُلجھ جانا
کمالِ ہوش ہے، مدہوشئ بادِ صبا کیا ہے
یہ سب تسلیم ہے مجھ کو مگر اے داورِ محشر،
محبت کے سوا جرمِ محبت کی سزا کیا ہے

مجھے نیند آ گئی ہے سایۂ زلفِ پریشاں میں
تجھے یہ فکر ہے ہنگامۂ روزِ جزا کیا ہے

نگاہِ ناز کو صورت گرِ آغاز ہونے دے
عیاں ہو جائے گا تجھ پر کہ تیری انتہا کیا ہے

روشؔ ! کیوں زندگی نے اپنے چہرے سے نقاب الٹی
مجھے سمجھا ہے شاید اجنبی یہ ماجرا کیا ہے

(فروری ۱۹۴۱ء)

بدلے ہزار رنگ ، رخِ روزگار نے
دی فرصتِ نظر ، نہ ترے انتظار نے

فردا بھی اب حکایتِ ماضی سے کم نہیں
دیکھا تھا خواب سا دلِ بے اعتبار نے

پھر زندگی ہی نالۂ خاموش بن گئی
پھر ضبطِ غم چلا ہے کسی کو پکارنے

مجبوریوں کا نام ، نہیں ہے رضائے دوست
سمجھا دیا یہ جذبۂ بے اختیار نے

مستی ہے غازۂ رخِ ہستی کہ خاک کو
گلشن بنا دیا ہے جنونِ بہار نے

مجھ کو گناہگارِ تمنا کیا روشؔ
معصومئ نوازشِ بیگانہ وار نے

(لکھنؤ ۱۹۳۷ء)

ادھر طوفاں گزرتا جا رہا ہے ادھر ساحل ابھرتا جا رہا ہے
بہت سادہ حقیقت ہی محبت زمانہ رنگ بھرتا جا رہا ہے
دوام زندگی کا لگ گیا روگ بشر بے موت مرتا جا رہا ہے
نجانے کتنے طوفاں ہیں نظر میں بہ ظاہر دل ٹھہرتا جا رہا ہے
مسرت آنسوؤں میں ڈھل رہی ہی جمالِ غم نکھرتا جا رہا ہے
زباں پر اور کچھ ہی دل میں کچھ اور عجب اخلاص پڑتا جا رہا ہے
کسی کی پرسشِ پنہاں سی دل پر عجب عالم گزرتا جا رہا ہے
روشؔ! کچھ بھی کہو، لیکن زمانہ
بہر صورت سنورتا جا رہا ہے

(سنہ ۵۲ء)

عشق میں شانِ کبریائی ہے بندگی عشق کی خدائی ہے
خواب ہی خواب، راحتِ منزل زندگی دردِ نارسائی ہے
کہیں صدیوں میں عشق کی اک بات مصلحت کی زباں تک آئی ہے
بے صدا تھی شکستِ شیشۂ دل چشمِ پیمانہ کیوں بھر آئی ہے
آتشِ دل ہے، دامنِ دل تک غیر پر کب یہ آنچ آئی ہے
ہم نشیں جامِ وعدۂ فردا زہر آلودۂ جدائی ہے
کیا بڑھائیں قدم، کہ اب سر پر بارِ احسانِ رہ نمائی ہے
دور ہے دامنِ تغافلِ ناز سرنگوں آتشِ جدائی ہے

اہلِ منزل پہ وقفۂ آرام اعترافِ شکستہ پائی ہے

حسن کو اب یہ غم ہے دامن گیر عشق نے کیوں شکست کھائی ہے

چشمِ ساقی سے ہے گلہ کہ روش

ہم پہ الزامِ پارسائی ہے

(۳۹ء)

زندگی سر بگریباں غمِ تدبیر میں ہے

خوابِ آدم ابھی گہوارۂ تعبیر میں ہے

حال پوچھا ہے کسی نے تو یہ ہے رنگِ بیاں

جیسے صدیوں کی خموشی مری تقریر میں ہے

حُسنِ اسرارِ صنم خانۂ ہستی، توبہ،

بُت شکن خود بھی یہاں عالمِ تصویر میں ہے

غمِ ہستی کبھی ویرانۂ بے پایاں تھا

اب یہ صحرا بھی مرے حلقۂ زنجیر میں ہے

ہے ہر اک صورتِ تعمیر زوال آمادہ

حسنِ باقی تو ابھی حسرتِ تعمیر میں ہے

دور ہی دور ذرا گردشِ دوراں! کہ روش

منسلک، سلسلۂ زلفِ گرہ گیر میں ہے

مشاعرہ سہارنپور

(۱۹۴۵-۴۶ء)

تصوّر کو صنم آرا نہ کرتے ہم تو کیا کرتے
بہ ہر صورت تجھے دیکھا نہ کرتے ہم تو کیا کرتے
کسی صورت سے رازِ عشق کو پوشیدہ رکھنا تھا
تجھے اے زندگی رُسوا نہ کرتے ہم تو کیا کرتے
دوامِ عشرتِ امروز ممکن ہی نہ تھا یا رب،
یقینِ جنّتِ فردا نہ کرتے ہم تو کیا کرتے
یہ آتش ملتہب تھی سایۂ دامانِ ساقی سے
طوافِ شعلۂ مینا نہ کرتے ہم تو کیا کرتے
رَوشؔ! دیکھا انھیں خود جلوہ فرما مسندِ دل پر
اب اس کے بعد بھی سجدہ نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

(رام پور ۱۹۵۱ء)

وہ غم جو دل میں پنہاں ہو گیا ہے
بہ ہر صورت نمایاں ہو گیا ہے
سکونِ دل جو میرا ہم نشیں تھا
اب اک خوابِ پریشاں ہو گیا ہے
حجابِ چہرۂ دانش اُٹھا کر
بہت محجوب انساں ہو گیا ہے
یہ کیوں فریاد آمادہ ہے ساحل
یہ کیوں خاموش طوفاں ہو گیا ہے
جہاں دامن بچایا مصلحت نے
وہیں آلودہ داماں ہو گیا ہے
خراباتی تو کیا ہوتا، زمانہ
خرابِ کفر و ایماں ہو گیا ہے
رَوشؔ مرتے تھے دشواری پہ جس کی
وہ کارِ عشق آساں ہو گیا ہے

(۱۹۴۶ء)

جشنِ آبادیٔ میخانہ ابھی باقی ہے

آ گئے سب کوئی دیوانہ ابھی باقی ہے

کیا یہی جلوہ گہِ بُت شکنی تھا یا رب

دل کی صورت میں جو بُت خانہ ابھی باقی ہے

عشق کی لغزشِ مستانہ سے عالم ہے تباہ

حُسن کی لغزشِ مستانہ ابھی باقی ہے

لا، کہیں اور سے کچھ زہر ملامت زاہد

تہمتِ جرأتِ رندانہ ابھی باقی ہے

دل شکستہ بہت آئے بھی گئے بھی لیکن

بزم میں گردشِ پیمانہ ابھی باقی ہے

اس میں وہ شمع نہاں ہے جو بجھے گی نہ کبھی

یہ جو خاکسترِ پروانہ ابھی باقی ہے

زندگی مجھ سے کہاں آنکھ ملائے گی روشؔ

پرتوِ نرگسِ مستانہ ابھی باقی ہے

(مارچ ۱۹۴۸ء)

داستانِ شوق کا آغاز ہے — میری خاموشی تری آواز ہے
اے گرفتارِ فریبِ آشیاں — زندگی پرواز ہی پرواز ہے
لغزشوں میں بھی یہ خودداری مری — نرگسِ مخمور کا اعجاز ہے
دل وہاں اب جلوہ فرما ہے جہاں — ہر تمنّا فرشِ پا انداز ہے
اے غرورِ کامگاری یہ نہ پوچھ — کیوں مجھے ناکامیوں پر ناز ہے
حسنِ ناتمکیں، محبت بے خبر — کون مصروفِ شکستِ راز ہے
نیم شب ہے، اور چشمِ انتظار — آنسوؤں کی جلوہ گاہِ راز ہے
حُسن ہے یا عشق کچھ کھلتا نہیں — زندگی! یہ کون تیرا انداز ہے
حُسن کا عالم بدلتا ہی رہا — عشق کا اب تک وہی انداز ہے

اے رَوِشؔ! اے محرمِ حسنِ غزل
حُسن کو تیری غزل پر ناز ہے

(۱۹۴۱ء)

رَوِشؔ! یہ شکوۂ حسن رمیدہ خو کیا ہے
رمیدگی کے سوا رازِ رنگ و بو کیا ہے
اگر نہیں ہے غمِ تشنگی کی رسوائی
تو پھر یہ گردشِ پیمانہ و سبو کیا ہے
یہاں تو غازۂ روئے حیات ہے درکار
یہ آنسوؤں میں لرزتا ہوا لہو کیا ہے

فریبِ منزلِ ترک و طلب سمجھتا ہوں
یہ کیا کہوں کہ تقاضائے جستجو کیا ہے
چلی ہے مصلحتِ وقت کے قدم چھو کر
ہوائے دامنِ ساحل کی آبرو کیا ہے
کہاں کا خوابِ عدم، کیا خیالِ عمرِ ابد
یہ دیکھ عالمِ گیسوئے مشکبو کیا ہے
سکوتِ تمکنتِ ناز کچھ تو ہو ارشاد
دلِ رَوِش میں یہ طوفانِ آرزو کیا ہے

(فروری ۵۳ء)

دنیا غمِ تعبیر میں کیوں چیں بہ جبیں ہے
وہ حُسنِ دل افروز کوئی خواب نہیں ہے
محسوس ہوا سرحدِ امکاں سے گزر کر
اربابِ وفا کی کوئی منزل ہی نہیں ہے
بیگانۂ اوہام ہے آغازِ محبت
اس صبح کی آغوش میں خورشیدِ یقیں ہے
اے اہلِ نظر! یہ بھی کسی پر ہوا روشن
عالم ہے حسیں یا نگہِ شوق حسیں ہے
باطن میں ہر اک لمحہ احساس ہے سجدہ
ظاہر میں کوئی در ہے نہ آغوشِ جبیں ہے

افلاک نشیں جس کی لپٹ سہہ نہ سکیں گے
وہ شعلۂ غم زینتِ دامانِ زمیں ہے

رہنے دے یہ افسانۂ فردا ابھی زاہد
معلوم ہے کس کو کہ یہ دُنیا ہی وہ دیں ہے

ہے بُت کدۂ دہر کا خاموش اشارا
وہ "حسنِ گریزاں" کہیں محدود نہیں ہے

اے شیخِ حرم! حالِ رَوِش بھی ہوا معلوم
سنتے ہیں کوئی رندِ خراباتِ نشیں ہے

(جنوری ۳۷ سنہ ء)

در پردۂ خزاں و بہاراں کچھ اور ہے
میری نظر میں حُسنِ گلستاں کچھ اور ہے

ہے یوں تو ہر نشاط قدم بوس عاشقاں
لیکن اشارۂ غمِ جاناں کچھ اور ہے

یہ داستاں نہیں رخ و گیسو پہ منحصر
افسانۂ جمال کا عنواں کچھ اور ہے

بینائیٔ خرد ہے نہ بیباکیٔ جنوں،
اے دوست رازِ چاک گریباں کچھ اور ہے

زاہد ترا نشیمنِ ایماں سہی بلند
لیکن مرا تصوّرِ ایماں کچھ اور ہے
پنہاں نہ رہ سکے، جو عیاں بھی نہ ہو سکے
وہ حسن کی ادائے پشیماں کچھ اور ہے

برحق ہے راحتِ سر و ساماں، مگر روشؔ!
لطفِ حیاتِ بے سر و ساماں کچھ اور ہے

(۵ مارچ سنہ ۳۶ء)

آتشِ سینۂ افلاک کہیں تک پہنچے
سرد ہو جائے جو ہم اہلِ زمیں تک پہنچے
کس کو معلوم، کہ ہم حسن شناسانِ ازل
کتنے اوہام سے گزرے تو یقیں تک پہنچے
ہے مرے دل کی امانت تری زلفوں کی قسم
وہ شکن جو غمِ دوراں کی جبیں تک پہنچے
جتنے ساغر بھی گئے وقت نے زہر آلودہ
سب وہ رندانِ خرابات نشیں تک پہنچے
شکوۂ دہر سہی، حالِ غمِ دل نہ سہی
آ گئی بات زباں پر تو کہیں تک پہنچے
نکہت پیرہن دوست کہ خوشبوئے بہار
کس کو فرصت ہے کہ دلہائے حزیں تک پہنچے

کیا سمجھ کر حرم و دیر میں فریاد کریں
کون اُس دشمنِ دل، دشمنِ دیں تک پہنچے
غمِ ہستی نے جہاں سے بھی پکارا اے دوست
ہم اسیرانِ غمِ عشق وہیں تک پہنچے
مہرباں ساقیٔ محفل کو جو دیکھا ہے روش
اب یہ ضد ہے کہ ہر اک جام ہمیں تک پہنچے

(۵ شنبہ)

شکست دل کی قیمت ساغر گل رنگ کیا کہیئے
یہ میخانہ ہے یا انبارِ خشت و سنگ کیا کہیئے
یہاں اک اک قدم پر آسرا ہے ہم کو منزل کا
کھنچی جاتی ہے منزل سیکڑوں فرسنگ کیا کہیئے
حوادث کے دبے پاؤں کی آہٹ سُن تو سکتے ہیں
مگر یہ عشق کی رفتارِ بے آہنگ کیا کہیئے
حرم افسردہ و خاموش بُت خانے میں سنّاٹا
کہاں ہیں دوستانِ یک دل و یک رنگ کیا کہیئے
خزاں کے بعد گلشن میں بہار آئی تو ہے لیکن
اڑا جاتا ہے کیوں اہلِ چمن کا رنگ کیا کہیئے
ہمیں تو عشق کا آزار ہے اے ہم نشیں لیکن
یہ اہلِ ہوش کیوں ہیں زندگی سے تنگ کیا کہیئے

ہزار اندوہ وغم اک نغمۂ عشرت ہیں پوشیدہ
بہت نازک ہے روداد رباب و چنگ کیا کہیئے
رَوش مفہومِ صلح و دوستی ہم بھی سمجھتے ہیں
رہی ہے آج تک ہر مصلحت سے جنگ کیا کہیئے

(فروری ۵۲ء)

شکستِ نغمہ، روحِ ساز کا پیغام ہو جائے
اجازت ہو تو اب رازِ محبت عام ہو جائے
ہر اک ذرہ جہاں منزل ہے خورشیدِ محبت کی
وہیں اے کاش! صبحِ زندگی کی شام ہو جائے
اسے اے جذبۂ بے اختیارِ عشق کیا کہیئے
کہ دل ہر بات پر خود موردِ الزام ہو جائے
نہ پُرسش ہو کسی سے چاکِ دامانِ محبت کی
وہاں بھی کاش! میری وحشتوں کا نام ہو جائے
وہیں سے ابتدا ہوتی ہے اقلیمِ محبت کی
جہاں مجبورِ دورِ گردشِ ایّام ہو جائے
جو آغازِ محبت کا کوئی انجام ہوتا ہے
تو آغازِ محبت ہی مرا انجام ہو جائے
رَوش! ہم بڑھ کے خود کوئے ملامت کے قدم لیں گے
بلا سے زندگی تہمت بنے، الزام ہو جائے

(۲۷ء)

جہانِ آب و گل اربابِ جاں کی آزمائش ہے
یہ بت خانہ ترے حسنِ گماں کی آزمائش ہے

ستاروں پر مدارِ رہبری تھا ظلمتِ شب میں
قریبِ صبح، خضرِ کارواں کی آزمائش ہے

سہارا لے لیا ہے زندگی نے فکرِ درماں کا
سکونِ دردمندانِ جہاں کی آزمائش ہے

حرم نادیدہ، بُت خانہ گریزاں، برہمن رہبر
کسی آوارۂ کوئے بتاں کی آزمائش ہے

زمانے کا تغافل ہو، کہ خود اپنی کم آمیزی
بہ ہر صورت خلوصِ دوستاں کی آزمائش ہے

یہاں ہیں شکوہ ہائے برملا، اور اُس کی محفل میں
فغاں کے ساتھ آدابِ فغاں کی آزمائش ہے

گوارا کر رہا ہوں قیدِ زندانِ حوادث کو
سمجھتا ہوں دلِ بے خانماں کی آزمائش ہے

بہار آتے ہی حسنِ لالہ و گل خود عیاں ہوگا
خزاں جب تک ہے، خاکِ گلستاں کی آزمائش ہے

بہت الزام تھے اب تک مری پرہیزگاری پر
مگر اب لغزشِ پیرِ مغاں کی آزمائش ہے

سکونِ مرگ سے مانوس ہے پھر شورشِ ہستی،
خداوندا! حیاتِ جاوداں کی آزمائش ہے

گریزاں ہو رہا ہے، دامنِ شب، شمع لرزاں سے
یقیں کے ساتھ، پیمانِ گماں کی آزمائش ہے

بہت میں نے ستم ہائے جہاں کے ناز اٹھائے ہیں
مری آشفتگی، سارے جہاں کی آزمائش ہے

تغافل کی حدوں سے بڑھ گیا ہے کوئی دیوانہ
کسی کے التفاتِ ناگہاں کی آزمائش ہے

سمجھتا بھی ہے دردِ بیدلی کو دیکھنا ہے یہ،
سکوتِ نالۂ دل، آسماں کی آزمائش ہے

زمانہ جس کو سمجھا، امتحانِ صبرِ مظلومی،
وہی دراصل عزمِ کامراں کی آزمائش ہے

گزاری، زندگی کی رات، آنکھوں میں مگر خوش ہوں
یہ بیداری، ترے خوابِ گراں کی آزمائش ہے

ستم کش مطمئن ہیں ان مصائب کے پہاڑوں سے
ستم گر، تیرے دوشِ ناتواں کی آزمائش ہے

کہاں کا سبزۂ بیگانہ، کیسے لالہ و ریحاں؟
چمن والو! یہ سارے گلستاں کی آزمائش ہے

بہت ہی سرگراں ہیں شعلہ ہائے شمع آزادی
روشؔ! اب دامنِ ہندوستاں کی آزمائش ہے

(جنوری سنہ ۴۹ء)

نشۂ زہد، نہ کیفِ مئے ناب اچھا ہے
ایک معصوم سا پندارِ شباب اچھا ہے
نہ یقیں ہو تو اُسی نرگسِ مخمور سے پوچھ
عشق جتنا بھی ہو سرشار و خراب اچھا ہے
سازِ ناہید تلک ہو کہ دلِ بشکستہ
درد مضراب ہو جس کی وہ رباب اچھا ہے
کچھ بھی ہو حیرتِ نظارہ کہ تمکینِ جمال
حسن ہر رنگ میں مانوسِ حجاب اچھا ہے
ربطِ خاطر اسے کہتے ہیں کہ اینک نہ کھلا
لطف اچھا ہے تمھارا کہ عتاب اچھا ہے
میکشوں کو ابھی احساس ہے مدہوشی کا
ابھی طاری رہے افسونِ شراب، اچھا ہے
اک نگاہِ غلط انداز ہو جس کی تعبیر
لاکھ بیداریِ عالم سے وہ خواب اچھا ہے
ماورا، عالمِ اسباب سے ہے عالمِ عشق
سب سوالوں کا یہی ایک جواب اچھا ہے
زندگی، حرفِ غلط، بے رخِ محبوب روش
ورنہ یوں مشغلۂ علم و کتاب اچھا ہے

(۳۷ء)

محبّت ، کاش شایانِ جمالِ یار ہو جائے
نگاہوں میں بسے ہوں خواب، دل بیدار ہو جائے

ہزاروں طور اُسی کی حسرتِ دیدار پر قرباں
کہ جس کی زندگی ہی حسرتِ دیدار ہو جائے

محبّت میں یہ ناممکن نہیں ، اے منکرِ الفت
کہ خود انکار ہی صورت گرِ اقرار ہو جائے

مرا خوابِ تمنّا اُن حسیں راہوں سے گزرا ہے
تصوّر سے بھی جن کے زندگی بیدار ہو جائے

اٹھی ہے جانبِ دل، چشمِ مستِ ساقیِ رنگیں
یہ پیمانہ چھلکنے کے لئے تیار ہو جائے

روِش اس لغزشِ پیہم میں پایا وہ سکوں میں نے
جسے پا کر سنبھلنا اور بھی دشوار ہو جائے

(سنہ ۳۳ء)

دل معتکف ہے ، ذوقِ تماشا سفر میں ہے
منزل قدم کے ساتھ ، قدم رہ گزر میں ہے

اے چشمِ انتظار ! یہ عالم ہے دیدنی
صدیوں کا فاصلہ مری شام و سحر میں ہے

لاکھوں تسلّیاں ہیں، مگر صورتِ سکوں
میری نظر میں ہے نہ دلِ چارہ گر میں ہے

اے دوست! میری سُست روی کا گلہ نہ کر
میرے لئے تو خود مری منزل سفر میں ہے
دامن بچا رہا ہے محبّت کی آگ سے
زاہد، ہنوز کشمکشِ خیر و شر میں ہے
تکتا ہے کیا فلک کی طرف بہرِ آشیاں
بنیادِ آشیاں تو ترے بال و پر میں ہے
جس کے لئے روش! دلِ مشرق ہے منتظر
وہ صبحِ انقلاب ابھی رہ گزر میں ہے

(۱۹۴۳ء)

دل ہے ہجومِ زارِ تمنّا ترے لئے
آباد کر رہا ہوں یہ دُنیا ترے لئے
مانا! طلسمِ وعدۂ فردا فریب ہے
سب کچھ نثارِ وعدۂ فردا ترے لئے
جو آج تک کسی سے گوارا نہ ہو سکا
اے دوست! وہ کروں گا گوارا ترے لئے
ہر چند کفرِ عشق ہے افشائے رازِ عشق
یہ کفر بھی مجھے ہے گوارا ترے لئے

جانِ حزیں پہ حسرتِ درماں بھی بار ہے
میں بن گیا ہوں درد سراپا ترے لئے
اے آبروئے محفلِ کونین! کچھ تو سوچ
تیرا روش ہے دہر میں تنہا ترے لئے

(سنہ ۲۶ء)

مری وفا کے فسانے سُنائے جائیں گے
یہ گیت سارے زمانے میں گائے جائیں گے
ہوس پرست کہاں، امتحانِ عشق کہاں
جو باوفا ہیں وہی آزمائے جائیں گے
جو ضبطِ گریہ سے آنکھوں میں ٹوٹ ٹوٹ گئے
اُن آنسوؤں کے ستارے بنائے جائیں گے
ہزار خلق میں رسوا ہیں پھر بھی تیرا راز
چُھپائے جائیں گے سب سے چھپائے جائیں گے
بہا کرے دلِ خوں گشتہ اشک بن بن کر
ہمیں بھی ضد ہے کہ ہم مسکرائے جائیں گے
شکستِ زمزمۂ کائنات بن کے ردش
ہم اپنے دل کی کہانی سنائے جائیں گے

(سنہ ۲۴ء)

نگاہِ ناز میں ہلکا سا رنگِ ناتوانی ہے
محبت کی کہانی ہے محبت کی زبانی ہے

ہر اک لمحہ ہم آغوشِ حیاتِ جاودانی ہے
جو اُس محفل میں ہے وہ بے نیازِ زندگانی ہے

کسی کا لطفِ پنہاں مسکراتا ہے ہر آنسو میں
مری ناشادمانی ہم کنارِ شادمانی ہے

عجب کیا ہے وہاں پہنچے مرا حالِ پریشاں بھی
سُنا ہے بوئے گل شائستۂ رنگیں بیانی ہے

بسائی ہے وہ دنیا ایک ناکامِ محبت نے
جہاں ناکامیوں کے رُخ پہ رنگِ کامرانی ہے

وہاں کچھ شکوہ ہائے برملا لے کر چلا ہوں میں
جہاں ہر التجا منّت گزارِ بے زبانی ہے

مجھے کیا دخل اسرارِ بقا میں ہاں یہ سمجھا ہوں
یہ دردِ زندگی شاید عطائے حُسنِ فانی ہے

روشؔ! آخر مکمّل ہو گئی روداد محرومی
شکستِ سازِ دل بھی اب شریکِ بے زبانی ہے

(سنہ ۲۷ء)

مجھے وہمِ سکونِ دل نہیں ہے
کوئی طوفاں، مرا ساحل نہیں ہے

بہت مشکل سہی ترکِ تمنّا
محبت ہو تو کچھ مشکل نہیں ہے

کہاں تک چھپ سکے گا رنگِ حسرت
نظر آخر نظر ہے دل نہیں ہے

دفا بر حق مجھے یہ سوچ کیوں ہو
جہاں باطل ہے یا باطل نہیں ہے

سلامت گوشۂ آرام لیکن
مسافر کی کوئی منزل نہیں ہے

حدیثِ حسنِ خوباں نامکمل
اگر حسنِ نظر شامل نہیں ہے

محبّت سے یہ نفرت آہ ناصح
ترے سینے میں شاید دل نہیں ہے

روِش محفل میں ہم پہنچے تو دیکھا
وہی غارت گرِ محفل نہیں ہے

(سنہ ۳۱ء)

نہ مشاہدہ نہ مجاہدہ کوئی خواب ہے نہ خیال ہے
مری کائناتِ خموش میں نہ فراق ہے نہ وصال ہے

میں ہزار ضبط کروں تو کیا، میں ہزار کچھ نہ کہوں تو کیا
کہ دیارِ نازِ حبیب میں مری خامشی بھی سوال ہے

میں نثارِ رحمتِ عشق ہوں کہ بغیر عشق کے دہر میں
نہ کوئی نشاط نشاط ہے، نہ کوئی ملال ملال ہے

تری بے نیاز نوازشوں نے یہ بے نیاز بنا دیا
غمِ آرزو کا تو ذکر کیا، کوئی آرزو ہی محال ہے

کسی اعتکاف نشین دل پہ گمانِ کم نظری ہے کیوں
جو شریکِ بزمِ خیال ہے وہی ہم نشینِ جمال ہے

انھیں مرحلوں ہی پہ منحصر ہے نشاطِ تکملۂ سفر
یہ فریبِ کم نگہی ہے سب نہ زوال ہے نہ کمال ہے

جو نگاہِ حُسن شناس ہو تو عیاں ہے کچھ نہ نہاں ہے کچھ
دلِ باخبر ہی زباں بنے تو جو حال ہے وہی قال ہے

دلِ نامراد کی بیکسی، مجھے بامُراد بنا گئی،
جو عزیزِ خاطرِ دوست ہو وہ مآلِ حُسنِ مآل ہے

دلِ زندہ اس پہ فدا روشؔ، مرے دل کی ہے وہی زندگی
جو مُرادِ عشقِ اویسؓ ہے جو قرارِ جانِ بلالؓ ہے

(۱۹۳۲ء)

مجھ کو روکا تھا جہاں سنگِ دل آزاری نے
پھول برسائے وہاں بھی مری خودداری نے

فرصتِ جنبشِ مژگاں بھی نہیں ہے مجھ کو
خواب دیکھا ہے کچھ ایسا مری بےداری نے

یوں بھی کچھ کم تو نہ تھا مرحلۂ غم دشوار
اور دشوار بنایا تری غم خواری نے

میرے اشکوں کا بھرم کھل ہی چکا تھا اے دوست
بات رکھ لی ترے دامن کی گہرباری نے

اب پس و پیش کا ہنگام نہیں اے دل
خود پکارا ہے مجھے راہ کی دشواری نے

سرگراں ہے نگہِ ناز، مبارک ہو روش!
رنگ بدلا ہے تغافل کی ستم گاری نے

تغافل اعتبارِ عشق کی بنیاد ہوتا ہے
اسی بُنیاد پر شہرِ وفا آباد ہوتا ہے

فضائے دشت ہو، صحنِ چمن ہو، آشیانہ ہو
دلِ آزاد ہر زنجیر سے آزاد ہوتا ہے

ہماری زندگی پروازِ پیہم ہے، ہمیں کیا غم
کہاں زنجیر ہوتی ہے، کہاں صیّاد ہوتا ہے

فغانِ روح بتیابی ہے خاموشی محبّت کی
سکوتِ ناز بھی اک عالمِ فریاد ہوتا ہے

عیاں حالِ چمن بیرونِ دیوارِ چمن کیا ہو
مگر اندازۂ بے مہریٔ صیاد ہوتا ہے

بہت رنگین و شریں ابتدا ہے خوابِ الفت کی
مگر انجام، خونِ حسرتِ فرہاد ہوتا ہے

غرورِ خلد زاہد، ترکِ دنیا کے بھروسے پر
سنبھل، اے بے خبر کیوں خانماں برباد ہوتا ہے

فراموشی ہے شاید ماحصل میرے فسانے کا
زمانہ بھولتا جاتا ہے جتنا یاد ہوتا ہے

روش اس کی نظر میں سنگریزے کیا جواہر کیا
بہت ہی تنگ دل الفاظ کا نقّاد ہوتا ہے

(۳۲ سنہ ء)

کیوں سکوتِ نگاہ ہے پیارے
کیا محبّت گناہ ہے پیارے

حاصلِ عمرِ جاوداں شاید،
فرصتِ یک نگاہ ہے پیارے

خلق سے پرسشِ محبّت کیوں؟
یہ تو میرا گناہ ہے پیارے

اس قدر کیوں ملال ہے تجھ کو
عشق خود ہی تباہ ہے پیارے
میری تنہائی و کم آمیزی،
تجھ سے ملنے کی راہ ہے پیارے
حال میرا چھپا نہیں تجھ سے
تیری غفلت گواہ ہے پیارے
دوست ملتے ہیں اجنبی بن کر
کچھ عجب رسم و راہ ہے پیارے
تیری ہر اک نظر کے پردے میں
وہی پہلی نگاہ ہے پیارے
جس پہ قرباں ہزار حُسنِ یقیں
وہ ترا اشتباہ ہے پیارے
عشق خود خانماں خراب سہی
زندگی کی پناہ ہے پیارے
یہ جو پھرتا ہے تجھ سے دور روش
سخت گم کردہ راہ ہے پیارے

(سنہ ۳۲ء)

وصال شاہد معنی کی صورت ہوتی جاتی ہے
محبّت خود ہی مقصود محبّت ہوتی جاتی ہے

وہ اک تسکیں جواب تک چارہ سازِ دردِ الفت تھی
وہ تسکیں بھی شریکِ دردِ الفت ہوتی جاتی ہے

خموشی سے بھی بارِ ترجمانی اُٹھ نہیں سکتا
بہت غمناک رودادِ محبّت ہوتی جاتی ہے

ہر اک گم گشتگی ہے، خضرِ راہِ عشق کی رحمت
ہر اک لغزش سے معراجِ محبت ہوتی جاتی ہے

بڑھانا چاہتا ہوں وسعتیں، خوابِ محبّت کی
مجھے اے زندگی تیری ضرورت ہوتی جاتی ہے

دلِ بے آرزو ہے، اور حریمِ حُسن بے پروا
لطافت خلوت آرائے لطافت ہوتی جاتی ہے

وہ اقرارِ محبّت ہو کہ انکارِ محبّت ہو
بہ ہر عنوانِ تکمیلِ محبّت ہوتی جاتی ہے

رَوِش! اب ہم ہیں اور رازو نیازِ سوزِ محرومی
بہت محبوب شمعِ شامِ فرقت ہوتی جاتی ہے

(سنہ ۳۴ء)

حالِ غم کوئی سُنے بھی تو سُنائے نہ بنے
دلِ ناداں سے کوئی بات بنائے نہ بنے

کر دیا عشق کو درماں طلبی نے رسوا
غمِ دل بار نہیں ہے کہ اٹھائے نہ بنے

ادب آموزِ وفا، آتشِ دل ہے ورنہ
آپ دامن کو بچائیں تو بچائے نہ بنے

رفتۂ خوابِ تغافل ہی سہی حُسن، مگر
ہے وہ عالم کہ کسی طرح جگائے نہ بنے

ہائے وہ سایۂ داماں کہ رمیدہ ہی رہے
آہ وہ خوابِ گریزاں کہ بھلائے نہ بنے

دہر میں نقشِ محبت کو مٹا کر اک بار
کوئی سو بار بنائے تو بنائے نہ بنے

خوب دستورِ محبت ہے کہ اُس محفل میں
حشر ہو جائے مگر آنکھ اُٹھائے نہ بنے

بے رخی پر بھی نہ جانا کہ یہ ہے جذبۂ دل
کہیں دامن مرے ہاتھوں سے چھڑائے نہ بنے

کاش ایسا ہو کہ اُس جانِ نزاکت سے روش
بارِ تمکینِ تغافل بھی اُٹھائے نہ بنے

(۱۹۳۱ء)

یہ فیضانِ جمالِ ہم نشیں ہے
نیازِ عشق بھی ناز آفریں ہے

ہزاروں کارواں پہنچے بہت دور
مرادِ کارواں شاید یہیں ہے

نہ جانے کس کو دیکھا ہے کہ اب تک
نگاہِ آسماں سوئے زمیں ہے

زمانہ مجھ سے اُلجھا بھی تو ناحق
مرے دامن میں دنیا ہے نہ دیں ہے

یہ تنہائی، یہ ویرانی مبارک
جہاں میں ہوں، وہاں کوئی نہیں ہے

نگاہِ کفر و ایماں سے ہے پنہاں
وہ اک سجدہ جو مقصودِ جبیں ہے

جہاں چھوڑا تھا تیری جستجو نے
سنا ہے زندگی اب تک وہیں ہے

ہوائے خلد سے دامن بچا کر
روش کسی کے لئے خلوت گزیں ہے

(۱۹۴۴ء)

سوالِ وعدۂ فردا نہیں ہے
مجھے اب ہر قیامت کا یقیں ہے

محبت زہر ہے اور راحتِ جاں
تمنا درد ہے اور دل نشیں ہے

بہت کچھ ہے متاعِ درد، لیکن
نگاہِ ناز کے قابل نہیں ہے

جنوں ہر رنگ میں مسرور و شاداں
خرد! ہر حال میں چیں بر جبیں ہے

یہی دنیا بہ قدر ہوش و مستی
کبھی دوزخ کبھی خُلدِ بریں ہے
محیط ہر دو عالم ہے محبت
کوئی محمل میں بھی صحرا نشیں ہے
کبھی خود زندگی اک خواب موہوم
کبھی ہر خواب معراجِ یقیں ہے
گُل افشاں مسرّت ہیں ستارے
مرے آنسو ہیں اُن کی آستیں ہے
دلِ محبوب کاشانہ ہو جس کا
وہ غم کتنا حسین و نازنیں ہے
غزل ہائے رَوش اور خلوتِ ناز
مگر فیضِ جمالِ ہم نشیں ہے

(سنہ ۴۴ء)

کہیں بادہ، کہیں مینا، کہیں پیمانہ ہے
دور تک سلسلۂ نرگسِ مستانہ ہے
عشق ہے پیرِ مغاں عمرِ ابد میخانہ
ہر نفس ایک چھلکتا ہوا پیمانہ ہے
حُسنِ معصوم کی مستانہ خرامی توبہ
آسماں تک اثرِ لغزشِ مستانہ ہے

ہر قدم پر ہے وہی کشمکشِ ہجر و وصال
وادیٔ ہوش میں اب تک دلِ دیوانہ ہے
دل کہ تھا جلوہ گہ صورت و معنائے جمال
آج حیرت زدۂ کعبہ و بُت خانہ ہے
کیا یہ دنیا ہے کوئی جلوہ گہ خواب روشؔ
رات کی بات یہاں صبح کو افسانہ ہے

(سنہ ۲۷ء)

عشق دشوار نہیں خوش نظری مشکل ہے
سہل ہے کوہ کنی، شیشہ گری مشکل ہے
اس میں شامل ہے مرا حُسنِ طلب بھی اے دوست
ورنہ اس حُسن سے بیدادگری مشکل ہے
لگ گئی دامنِ گیسوئے پریشاں کی ہوا
ہوش میں آئے نسیمِ سحری مشکل ہے
مسندِ لالہ و ریحاں ہو کہ ہو تختۂ دار
ہم نشیں! چارۂ آشفتہ سری مشکل ہے
یہ حقیقت کوئی اربابِ خبر سے پوچھے
کس قدر مرحلۂ بے خبری مشکل ہے
دلِ بیدار کا اب اور ہی عالم ہے روشؔ
لب تک آجائے فغانِ سحری مشکل ہے

(اگست سنہ ۵۴ء)

جمال کو بے نقاب کر دے، شباب کو بے حجاب کر دے
قسم ہے معصومیوں کی تجھ کو نظامِ فطرت خراب کر دے

وہ قیس ہی تھا کہ جیب و داماں کی دھجیوں سے رہا الجھتا
میں اس جنوں کی تلاش میں ہوں جو چاک تیرا نقاب کر دے

زمانہ ذوقِ وفا کا دشمن، وفا کو امیدِ دوست داری
اِدھر جہاں ہے اُدھر وفا ہے، خدا جسے کامیاب کر دے

کہاں تک اب ان پہاڑ راتوں کو تیشۂ بیکسی سے کاٹوں
مری محبت کے خواب آجا، غمِ جدائی کو خواب کر دے

کہاں وہ سوز و گداز نغموں میں، جو ہے پنہاں خموشیوں میں
رباب کو دور پھینک بھی دے، سکوتِ غم کو رباب کر دے

روش کی دیوانگی تو دیکھو چلا ہے اس کا کلیم بن کر
کہ جس کی ہر شانِ بے حجابی ہزار پیدا حجاب کر دے

(۲۶ سنہ ء)

جانِ محفل یہی غارت گر محفل ہو جائے
زندگی درد بنے، درد مرا دل ہو جائے

نکہتِ حور اُسے ہوش میں کیا لائے گی
جو تری یاد کے آغوش میں غافل ہو جائے

ہائے وہ شکوۂ غمہائے تغافل جس میں
کچھ سکوتِ نگہِ ناز بھی شامل ہو جائے

ہم نشیں اس میں زمانے کا بگڑتا کیا ہے
غم دوراں بھی جو ہم رنگِ غم دل ہو جائے

درس آموز حقیقت ہے یہ دنیائے جنوں
کوئی ناقص بھی یہاں آئے تو کامل ہو جائے

عشق وہ خواب نہیں ہے جو پریشاں ہو کبھی
حسن وہ سحر نہیں ہے کہ جو باطل ہو جائے

کتنے ارماں تھے کہ ہو مرحلۂ غم آساں
اب یہ حسرت ہے کہ کچھ اور بھی مشکل ہو جائے

ضد ہے جب عشق کی ٹوٹی ہوئی کشتی سے رَوشؔ
ابھرتا ہوا طوفاں ہی نہ ساحل ہو جائے

(سنہ ۳۶ء)

گلہ نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے
نگاہِ یار سلامت ہزار میخانے

ہر اک تجلّیٔ امروز ہو گئی روپوش
عجیب خواب دکھایا خیالِ فردا نے

مری شراب میں زہر خود آگہی تو نہ تھا
بدل دئے ہیں کسی خوش نظر نے پیمانے

حجابِ خلوتِ محبوب ہے یہ تنہائی
شریکِ انجمنِ ناز ہیں یہ ویرانے

خزاں کے بعد ضرور آئے گی بہار مگر،
اُجڑ کے لے نہ سکیں گے دلوں کے کاشانے

تری خبر ہے نہ اپنی خبر مگر پھر بھی
الجھ رہے ہیں غمِ آگہی سے دیوانے

ابھی تو دل ہے اسیرِ طوافِ بُت خانہ
طوافِ دل بھی تو اک دن کریں گے بتخانے

کنارِ درد میں نیند آ گئی محبت کو
ہوئے تمام فریبِ سکوں کے افسانے

جہاں خرابِ غمِ مرگ ہی سہی لیکن
ہنوز رقص میں ہیں زندگی کے پیمانے

یہاں بھی رحمتِ پیرِ مغاں سے ہو محروم
وہاں کی بات بھی اے زاہدو خدا جانے

گناہِ پاکیٔ داماں ہوا معاف روشؔ!
کیا ہے یاد اسی نازشِ زلیخا نے

کہاں ہے اے روشؔ خود نگر جواب تو دے
تجھے پکار رہے ہیں وطن کے بُت خانے

(۱۹۴۶ء)

بُت گر ہے نہ کوئی بت شکن ہے
سب وہم و گمانِ برہمن ہے
یہ کون شریکِ انجمن ہے
آنکھوں کو بھی حسرتِ سخن ہے
کیا ذکرِ بہار، خود خزاں بھی
دیوانۂ شاہدِ چمن ہے
آساں تو ہے جوئے شیر لیکن
کچھ اور ہی عزمِ کوہ کن ہے
کیا اس کے بغیر، زندگانی
مانا، وہ ہزار دل شکن ہے
اے آتشِ دل ادب ہے لازم
مجھ میں بھی وہ بوئے پیرہن ہے
کیا دل پہ گزر گئی کہ اب تک
پیشانیٔ وقت پُر شکن ہے
اب صبحِ وطن کا تذکرہ کیا
ہے شام جہاں وہیں وطن ہے
قدرت ہے خموش اور انساں
آوارۂ وادیٔ سخن ہے

خاکسترِ دل ہے اب دل افروز
پروانہ ہی شمعِ انجمن ہے
ویران سی ہو چلی ہیں راہیں
رہبر ہے نہ کوئی راہ زن ہے
اعجازِ غزل کہ خود روش سے
وہ جانِ کلام ہم سخن ہے

(جنوری ۵۱ء)

محبت، اک تپشِ ناتمام ہوتی ہے
نہ صبح ہوتی ہے اس کی نہ شام ہوتی ہے
جو راہ اہلِ خرد کے لئے ہے لامحدود
جنونِ عشق وہ چند گام ہوتی ہے
شرارِ آتشِ نمرود سے بھی ہے بدتر
وہ آرزو جو ہوس کی غلام ہوتی ہے
یہ کائنات ہے جس کے لئے سراپا گوش
تری ہی بات وہ اے خوش کلام ہوتی ہے
کچھ اس میں سرمد و منصور کی نہیں تخصیص
یہ رسمِ شہرِ محبت میں عام ہوتی ہے

ہر ایک جلوہ ہے میرے لئے کشش تیری
ہر اک صدا مجھے تیرا پیام ہوتی ہے
نمازِ عشق کا آتا بھی ہے جو ہوش کبھی
تو بیخودی مری بڑھ کر امام ہوتی ہے
وہ مرگِ مرگِ محبت ہے جس کا نام روش
چراغ راہ حیاتِ دوام ہوتی ہے

(سنہ ۲۵ء)

یہ کس بزمِ رنگیں میں آکر چلے
جو دیکھا وہ سب کچھ بھُلا کر چلے
ہے اب زندگی سایۂ عشق میں
ذرا موت دامن بچا کر چلے
جو تجھ سے ہی کہنے کی تھی ایک بات
وہی بات تجھ سے چھپا کر چلے
سلامت رہے دلنوازی تری
بڑا بوجھ دل پر اٹھا کر چلے
جو سب سے رہا آج تک اجنبی
ہم اُس غم کو اپنا بنا کر چلے

یہ کچھ کم نہیں ہے مآلِ وفا،
تجھے روشناسِ وفا کر چلے

بس اتنی سی تھی داستانِ حیات
ترے در پہ آئے صدا کر چلے

وہ شعلوں سے اکثر رہے ہم کنار
جو پھولوں سے دامن بچا کر چلے

چلے ہم تری انجمن سے، مگر
تری خلوتِ دل چرا کر چلے

نہ ملنے پہ تھے ہم نشینِ خیال
ملے تو نگاہیں چرا کر چلے

بہت ہوش تھا ہم کو پھر بھی روش
سوئے میکدہ لڑکھڑا کر چلے

(۱۹۴۹ء)

ہم آج کیا غمِ دوراں کی بات ٹالیں گے
تجھے بھی اے غمِ جاناں کبھی منالیں گے

ہے خاک پائے غریباں، جنھیں فروزِ حیات
مہ و نجوم زمیں پر کمند ڈالیں گے

ہے راہِ شوق میں کچھ اور لغزشوں کا مقام
قدم بہک ہی گیا ہے تو کیا سنبھالیں گے

جنھیں ملا تری آنکھوں سے زندگی کا ایاغ
وہ جامِ مرگ بھی ہنستے ہوئے اٹھالیں گے

یہ حادثے کہ جو اک اک قدم پہ حائل ہیں
خود ایک دن ترے قدموں کا آسرا لیں گے

بہت غیور ہیں آشفتگانِ زلفِ نگار
کبھی تو گردشِ دوراں کے بل نکالیں گے

زمانہ چیں بہ جبیں ہے تو بات کیا ہے روش
ہم اس عتاب پہ کچھ اور مسکرالیں گے

(نومبر ۵۲ء)

آگہی منجملۂ آدابِ میخانہ بھی ہے
ہوش کھو کر، زندگی کو ہوش میں لانا بھی ہے

کس سے کہہ دیں اپنے دل کی بات اصنامِ خموش
آج کوئی محرمِ اسرارِ بُت خانہ بھی ہے

کچھ تامُّل اے دلِ ناداں کہ مفہومِ حیات
زندگی سے اجنبی بن کر گزر جانا بھی ہے

دورِ محفل اب وہ آیا ہے کہ شمعِ انجمن
خود ہی افسانہ سرا ہی خود ہی افسانہ بھی ہے

کیوں رہینِ دشت پیمائی ہوں اب اہلِ جنوں
کیا یہ قدرِ وحشتِ دل کوئی ویرانہ بھی ہے

اہلِ ظاہر کا گلہ کب تک، کہ رازِ عشق کو
خود سمجھنا ہی نہیں، دنیا کو سمجھانا بھی ہے

شمع کے ضبطِ غمِ پنہاں پہ مرتا ہوں روشؔ
احترامِ جذبۂ بے تابِ پروانہ بھی ہے

(یونین پرنٹنگ پریس دہلی)

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی